Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

یکم جولائی ۲۰۱۸ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۱ ۔ شمارہ نمبر: ۱۳

پندرہ روزہ معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

ترکی کا قضیہ

محمد رضی الاسلام ندوی

ترکی کے صدارتی انتخابات میں رجب طیّب ایردوان کو کامیابی حاصل ہوگئی۔ اس خبر نے مجھے خوشی سے سرشار کر دیا اور میری طرح دنیا بھر میں لاکھوں کروڑوں انسان بھی اپنی مسرّت کو چھپا نہیں سکے۔ ٹھیک اسی طرح بہت سوں کی طرف سے منفی تبصروں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ وہ انہیں بدترین آمر ثابت کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور بطور ثبوت ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی کمزوریاں اور غلطیاں نمایاں کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جنھیں اس سے بھی تسلّی نہیں ہو رہی ہے، چنانچہ وہ زہر میں بجھے ہوئے طنز و تشنیع کے تیر برسا رہے ہیں اور ان کی جانب 'امیر المومنین' اور 'سلطان الامہ' جیسے القاب منسوب کر رہے ہیں۔

ہاں، ہمیں ترکی میں ایردوان کی کامیابی سے خوشی ہوئی ہے۔

اس لیے نہیں کہ ترکی میں اسلام کا بول بالا ہو گیا ہے، ''حق آ گیا ہے اور باطل مٹ گیا ہے''۔

اس لیے نہیں کہ ترکی میں ایردوان کے ذریعے خلافت علی منہاج النبوۃ قائم ہوگئی ہے۔

اس لیے بھی نہیں کہ ترکی میں سیاسی اسلام کو فتح حاصل ہوگئی ہے اور اس کے بدخواہوں کو منہ کی کھانی پڑی ہے۔

ہمیں خوشی اس لیے ہوئی ہے کہ ترکی میں اسلام کو جو دیس نکالا دیا گیا تھا اور مسلمانوں پر جو بدترین ظلم ڈھایا گیا تھا، اس کے خاتمے میں ایردوان کا بھی کچھ حصہ ہے۔

سب جانتے ہیں کہ ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانی کے الغاء کے بعد کمال اتاترک کے ذریعے اسلام کا نام لینا جرم قرار پایا تھا، شعائرِ اسلام پر پابندی عائد کر دی گئی تھی، مساجد کو اصطبل اور شراب خانوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا، اذان دینا اور قرآن پڑھنا ممنوع ٹھہرا تھا۔ یوں تو سیکولرازم یعنی لامذہبیت کو ریاست کا مسلک قرار دیا گیا تھا، لیکن حقیقت میں اس کے پردے میں اسلام کو کھرچ کھرچ کر پھینک دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ ظلم اتاترک کے بعد بھی دہائیوں تک جاری رہا۔ جن افراد نے اسلام سے اپنی وابستگی ظاہر کی انھیں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ قابل صد مبارکباد ہیں وہ لوگ جنھوں نے ان حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا اور جبر کے بدترین ماحول میں نئی نسل کے دل میں اسلام کی شمع جلائے رکھی۔ ہمیں ایردوان کی کامیابی پر اس لیے خوشی ہے کہ ہم انہیں اس سلسلۃ الذھب کی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔

ایردوان اور ان کے پیش رَو پروفیسر نجم الدین اربکان دونوں کا مطالبہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف جبر کا یہ ماحول ختم ہونا چاہیے جب انسانوں کے لیے بنیادی آزادی فراہم کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، اس کے تحت انھیں کھلی چھوٹ ہے کہ جو غلط کام کرنا چاہیں کریں، جس بے حیائی اور بداخلاقی کا مظاہرہ کرنا چاہیں کریں تو مسلمانوں کو آزادی کیوں نہ دی جائے کہ وہ اپنے دین کے تقاضوں پر عمل کر سکیں۔

اربکان اور ایردوان کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے کہ اربکان نے اپنی سیاست اسلام کے نام پر کی، چنانچہ حسبِ توقّع ان کی پارٹی کو بار بار پابندی کا سامنا کرنا پڑا، ان کی حکومت کی برخاستگی کی نوبت آئی، حتیٰ کہ سیاسی عمل میں ان کی شرکت پر بھی روک لگائی گئی، جب کہ ایردوان نے شعوری طور پر اسلام کا نام لینے سے احتراز کیا، اگرچہ اقدامات برابر ایسے کرتے رہے جن سے مسلمانوں کو آزادیاں نصیب ہوں اور وہ اپنی مرضی سے ارکانِ اسلام پر عمل کر سکیں اور شعائرِ اسلام سے اپنے تعلّق کا اظہار کر سکیں۔ ایردوان کے کام کا خلاصہ محبّ مکرّم پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے ایک موقع پر ایک جملے میں یوں بیان کیا تھا: ''ایردوان نے ترکی کو جبری کفر سے اختیاری کفر تک پہنچا دیا''۔

ہمیں ایردوان کی کامیابی پر اس لیے خوشی ہے کہ اس نے دنیا کے مختلف ممالک میں مسلمانوں پر ہو رہے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی، شامی مہاجرین کی بہت بڑی تعداد کو اپنے یہاں پناہ دی، فلسطینی کاز کی حمایت کی، غزّہ کے محصور مسلمانوں کے لیے امدادی سامان بھجوایا، مصر کی جائز منتخب حکومت کے سربراہ مرسی کی اخلاقی حمایت کی اور اخوان المسلمون پر سیسی حکومت کے مجرمانہ مظالم کے خلاف آواز بلند کی اور بنگلا دیش میں برما کے بے یار و مددگار مسلمانوں کے لیے امدادی سامان بھجوائے۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب ایردوان کی لفّاظیاں اور زبانی جمع خرچ ہے، لیکن سوچنا

اندرونی صفحات پر:۔

- ترکی میں کیا ہوا؟
- رواں صدی میں امریکا کا سب سے بڑا دھوکا!
- غزہ: احتجاج کے سوا کچھ کرنے کو نہیں!
- اسرائیل۔فلسطین: نئے معاہدے کی کوششیں
- سید مودودیؒ کی فکری کاوشوں کی عصری معنویت
- اوپیک کسی کے باپ کی جاگیر نہیں!
- قطر بحران، ایک سال بعد
- ڈرون ٹیکنالوجی: فضاؤں میں ایک نیا اضافہ

چاہیے کہ دوسرے مسلم حکمرانوں سے تو یہ بھی نہ ہو سکا، بلکہ ان کی نہ صرف ہمدردیاں، بلکہ ان کا دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح کا تعاون ظالموں کو حاصل رہا۔

ہم نہیں کہتے کہ ایردوان نے ترکی میں اسلامی خلافت قائم کردی ہے۔ اس کا دعویٰ خود ایردوان کو بھی نہیں ہے، ان کی پارٹی کے دستور کی بنیاد اسلام پر نہیں ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ایردوان کے اقدامات سے مسلمان دینی اعتبار سے ان آزادیوں سے بہرہ ور ہوئے ہیں جن سے وہ محروم تھے۔ ان شاءاللہ ایک وقت آئے گا جب کھلّم کھلّا اسلام کا نام لیا جا سکے گا اور ترکی کے حکمرانوں کے لیے کتاب و سنّت کے مطابق نظمِ مملکت کو چلانے کے عوامی مطالبے کو ٹالنا ممکن نہ ہو سکے گا۔

ہمیں افسوس ہے کہ ایردوان کا مذاق اڑانے اور انھیں 'امیرالمومنین' کا طعنہ دینے والے وہ لوگ ہیں جو خود کو کتاب و سنت کا علمبردار کہتے ہیں۔ یہ انہی کا ذہنی فساد ہے جو ان کی زبان پر آجاتا ہے۔ ہم نے یا ہماری طرح ایردوان کی کامیابی پر خوشی منانے والوں نے ایردوان کو اصطلاحی معنی میں کبھی 'امیرالمومنین' نہیں قرار دیا۔

ہمیں اس سے غرض نہیں کہ کون اپنا ہے اور کون پرایا؟ ہم تو ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں کہیں مسلمانوں پر ظلم وستم ہونے کی خبر ملتی ہے تو غمگین ہو جاتے ہیں اور کہیں مسلمانوں کو راحت اور آسانی پہنچنے کی اطلاع پہنچتی ہے تو خوش ہو لیتے ہیں۔

ترکی میں کیا ہوا؟

محمد عامر خاکوانی

ترکی کے صدارتی اور پارلیمانی انتخابات ختم ہوئے اور جیسا کہ اندازہ تھا یا یہ کہہ لیں پاکستان میں بعض حلقوں کے خدشے کے عین مطابق طیب ایردوان ترکی کے صدر منتخب ہو گئے، ان کی جماعت نے اپنی اتحادی جماعت کے ساتھ مل کر پارلیمان میں اکثریت (۶۰۰ میں سے ۳۴۴ نشستیں) حاصل کر لی ہیں۔ طیب ایردوان نے کرشمہ کر دکھایا ہے، اپنے مخالفوں کی سرتوڑ کوشش، مغربی ذرائع ابلاغ کی واضح متعصّبانہ پروپیگنڈا مہم اور امریکی و برطانوی حکومتوں کی ناپسندیدگی کے باوجود وہ جیت گئے۔ ایردوان جدید ترک تاریخ کے مقبول ترین اور سب سے طاقتور رہنما بن کر ابھرے۔ جدید ترکی کا بانی مصطفیٰ کمال اتاترک کے بعد پہلی بار کسی حکمران کو اتنی آئینی قوت، اختیار اور عوامی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اتوار کی شام بلکہ رات گئے جب کولمبیا فٹ بال ورلڈ کپ میں پولینڈ کے پرخچے اڑا رہا تھا، اس وقت عالمی نیوز چینلز ترک لیڈر کی فتح کے نعروں سے گونج رہے تھے۔ الجزیرہ، بی بی سی، سی این این اور بعض آن لائن ویب سائٹس کو دیکھتے ہوئے میں طیب ایردوان کی اس شاندار فتح کے اسباب اور ترکی میں جو کچھ ہوا، اسے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کوشش کرتا ہوں کہ ان کا نچوڑ قارئین کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ یہ ثابت ہو گیا کہ طیب ایردوان ترک سیاست کے اہم ترین لیڈر ہیں۔ ان کے بغیر سیاسی منظرنامہ مکمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی ترکی میں ان کا سیاسی متبادل سامنے آسکا ہے۔ حالیہ صدارتی انتخاب نے یہ بات اچھی طرح سے سمجھا دی ہے کہ ترک عوام کی بہت بڑی (پچاس فیصد سے زیادہ) تعداد طیب ایردوان کے ساتھ ہے۔ حزب اختلاف کے پاس کوئی ایسا امیدوار نہیں جو طیب ایردوان کی طرح مختلف حلقوں کے لیے قابل قبول ہو سکے۔ اس بار سب سے بڑی اپوزیشن جماعت ری پبلکن پیپلز پارٹی (CHP) کی جانب سے محرم انجے (Ince) کو پرکشش، کرشماتی شخصیت کے طور پر پیش کیا گیا۔ طیب ایردوان کے بہت سے ناقدین کا خیال تھا کہ ترکی کو ایک بے باک، شعلہ بیان اپوزیشن لیڈر مل گیا ہے جو ایردوان کو مشکل میں ڈال دے گا۔ انتخاب سے ایک دن پہلے میری پاکستان کے معروف لکھاری اور سیاسی کارکن فرخ سہیل گوئندی سے واٹس ایپ پر طویل گفتگو ہوئی۔ گوئندی صاحب ترکی کو طویل عرصے سے جانتے ہیں، وہاں وہ ہر سال کئی ماہ تک مقیم رہتے ہیں، آج کل بھی ترکی ہی میں ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ محرم انجے کی صورت میں حزب اختلاف کی سب سے بڑی کمی دور ہو گئی ہے اور طیب ایردوان کے لیے جیتنا آسان نہیں، معاملہ ''رن آف الیکشن'' میں جانے کے قوی امکانات ہیں۔ نتائج نے سب اندازے غلط ثابت کر دیے۔ ترک سیاست کو سمجھنا بھی آسان نہیں، اپنے انتخابی نظام کی طرح اس کی داخلی سیاسی حرکیات بھی پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں کہ طیب ایردوان کو عام طور پر ہمارے ہاں ''اسلامسٹ رہنما'' سمجھا جاتا ہے، مغرب میں بھی ذرائع ابلاغ اور لکھنے والوں کا بڑا حلقہ یہی تصویر پینٹ کرتا ہے۔ اس کے باوجود یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ ترکی کی معروف اسلامسٹ جماعت ''سعادت (Felicity) پارٹی'' نہ صرف طیب ایردوان کی سخت مخالف ہے بلکہ اس نے ان انتخابات میں ترکی کی سب سے بڑی سیکولر جماعت (محرم انسے کی) CHP سے اتحاد کیا تھا۔ رفاہ پارٹی ممتاز اسلامسٹ ترک لیڈر نجم الدین اربکان

ترک پارلیمانی انتخابات کے نتائج

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

کے شاگردوں اور ساتھیوں پر مشتمل ہے۔ اربکان مرحوم ہی اس پارٹی کے فکری گرو تھے۔ یاد رہے کہ یہی نجم الدین اربکان ہی طیب ایردوان کے بھی سیاسی استاد اور رہنما رہے ہیں۔ ایردوان نے اپنی سیاست اربکان کی پارٹی سے شروع کی اور جب ترک اسٹیبلشمنٹ نے ان پر پابندی لگائی تو ایردوان نے عبداللہ گل اور دیگر نوجوانوں کے ساتھ مل کر اپنی جماعت جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی (Ak) بنائی تھی۔ جس نے ۲۰۰۲ء کے انتخاب جیت کر حکومت بنائی اور اب تک وہ مسلسل حکمران چلی آرہی ہے۔ پاکستان میں جماعت اسلامی کا دنیا کی دیگر اسلامی تحریکوں کی طرح نجم الدین اربکان کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے۔ مرحوم قاضی حسین احمد ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ جماعت کے لوگ ایک زمانے میں ایردوان کے بجائے اربکان کے زیادہ قریب تھے اور ان کی حمایت کرتے تھے۔ نجم الدین اربکان کی وفات کے بعد البتہ جماعت طیب ایردوان کے قریب آئی۔ جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ نوجوان کیڈر کے ہیرو طیب ایردوان ہیں، وہ انہیں مسلم دنیا کے ہیرو گردانتے اور مغرب کے خلاف ایک استعارہ کی حیثیت دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایردوان کی کامیابی کے ماڈل کو پاکستان میں منطبق کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں، مگر ان کے پرانے دوست اور ایک طرح سے ترکی کی ''جماعت اسلامی'' سعادت پارٹی والے ایسا نہیں سوچتے۔ ان کے خیال میں طیب ایردوان مغرب نواز اور استعمار کے ایجنٹ ہیں۔ ایردوان کو ناکام بنانے کے لیے ان ترک اسلامسٹوں نے ترک سخت گیر سیکولرسٹوں سے بھی ہاتھ ملا لیا اور ان کے ساتھ باقاعدہ سیاسی اتحاد بنا کر یہ انتخاب لڑا۔ سیکولر جماعت سی ایچ پی نے بھی یہ سمجھ کر اتحاد کیا کہ شاید سعادت پارٹی طیب ایردوان کے کچھ فیصد ووٹ توڑ لے۔ ایسا مگر ہوا نہیں، الٹا سعادت پارٹی کے امیدوار کو انتہائی کم ووٹ ملے۔ طیب ایردوان کے ۵۳ فیصد، ۲ کروڑ ۶۲ لاکھ ووٹ کے مقابلے میں سعادت پارٹی کے امیدوار نے ایک فیصد سے بھی کم، ۴ لاکھ ووٹ لیے۔ پارلیمانی انتخاب میں تو ایک لحاظ سے ترکی کی اس اسلامسٹ پارٹی کے ووٹوں سے کٹر سیکولر لوگوں کو فائدہ پہنچا۔

کرد فیکٹر

ترک سیاست کا ایک اہم عنصر کرد تنازع ہے۔ کرد ایران، عراق، شام اور ترکی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بدقسمتی سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی وجہ سے کردوں کا ایک الگ ملک نہیں اور ہر ملک میں انہیں دبانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کہیں یہ آزادی کی تحریک نہ چلا دیں۔ ترک عوام اور سول ملٹری اشرافیہ کرد آزادی کے نعرے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ترکی میں یہ بڑا حساس ایشو ہے اور اسلامسٹ، سیکولر، نیشنلسٹ غرض مین اسٹریم ہر سیاسی قوت پروکرد سیاسی جماعت یا سیاسی قوتوں سے فاصلے پر رہتی ہے۔ اس بار صدارتی انتخابات میں کرد لیڈر صلاح الدین دیمرتاش بھی امیدوار تھے، وہ پچھلے دو برسوں سے غداری کے الزامات میں جیل میں اسیر ہیں، انتخاب وہیں سے لڑا۔ انہوں نے ۴۱ لاکھ (تقریباً ساڑھے آٹھ فی صد) ووٹ لیے۔ طیب ایردوان کے سب سے بڑے حریف محرم انسے نے ایک کروڑ تیس لاکھ یعنی ۳۰ فیصد کے لگ بھگ ووٹ لیے، تیسرے نمبر پر کرد امیدوار دیمرتاش رہے، جبکہ چوتھے نمبر پر ایک اہم خاتون امیدوار میرل اکسنر (Aksener) تھیں، انہوں نے ۳۶ لاکھ یعنی ساڑھے سات فیصد کے قریب ووٹ لیے۔ اگر محرم انسے کے ساتھ میرل اکسعیر اور دیمرتاش کے ووٹ اکٹھے کر لیں تو یہ تقریباً ۴۳ فیصد بن جاتے ہیں۔ مسئلہ مگر یہ ہے کہ کرد ووٹ کسی کرد علیحدگی پسند یا پروکرد لیڈر ہی کو ملیں گے، اگر دیمرتاش نہ کھڑے ہوتے اور محرم انسے کے حق میں مہم چلاتے تب بھی ضروری نہیں کہ یہ ووٹ انسے کو مل سکتے۔ یہ وہ خلا ہے جس سے طیب ایردوان اور حکمران جماعت فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اسی کرد فیکٹر کی وجہ سے ترکی کی اہم اور پرانی نیشنلسٹ پارٹی MHP نے ایردوان کے ساتھ اتحاد کیا اور ایردوان کی جماعت کو اس بار پارلیمان میں اکثریت صرف ایم ایچ پی کی وجہ سے حاصل ہوئی، ورنہ ان کی جماعت سات نشستیں کم ہونے کے باعث سادہ اکثریت نہیں لے پائی تھی۔ یہ جماعت کردوں کے سخت خلاف ہے، کچھ عرصہ قبل طیب ایردوان نے کرد شدت پسندوں کے خلاف آپریشن کیا تھا، یہ فیکٹر ہی ان دونوں جماعتوں کے اتحاد کا باعث بنا۔ طیب ایردوان اب ترکی کے منتخب صدر ہیں۔ پچھلے سال ایک ریفرنڈم کے ذریعے صدارتی اختیارات میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا ہے۔ اب ترکی میں وزیراعظم کا عہدہ ختم ہوگیا اور صدر ہی چیف ایگزیکٹو ہوں گے۔ وہی کابینہ تشکیل دے گا۔ اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی نامزدگی کا اختیار بھی صدر کے پاس ہے، وہی آرمی چیف، ٹاپ بیوروکریسی کی ٹرانسفر پوسٹنگ وغیرہ کرے گا، نائب صدر بھی اسی نے نامزد کرنا ہے۔ ملکی بجٹ بھی ایوان صدر میں بنے گا، پارلیمنٹ نے اگر اس کی منظوری نہ دی تو پھر مالی بحران پیدا ہونے کے بجائے پچھلے سال کا بجٹ نافذ العمل ہوگا، یعنی پارلیمنٹ کا بجٹ نامنظور کرنا بے سود ہی جائے گا۔ پارلیمنٹ اگرچہ دو تہائی اکثریت سے صدر کا مواخذہ کر سکتی ہے، مگر آخری فیصلہ آئینی عدالت کرے گی، جس کے پندرہ میں سے بارہ جج صدر ہی نامزد کرتا ہے۔ ترک حزب اختلاف نے اتنے طاقتور صدارتی عہدے کی سخت مخالفت کی تھی، مگر ان کی مخالفت کا فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ اس انتخاب میں حزب اختلاف نے ایمرجنسی فوری ہٹانے کا وعدہ کیا، وہ ملک میں جمہوری اصلاحات، آزاد میڈیا، آزاد عدلیہ اور سیاسی جبر کے خاتمے کی باتیں اور وعدے کرتے رہے۔ طیب ایردوان نے معاشی خوشحالی کی باتیں کیں، اپنی کامیابیاں گنوائیں اور ترقی کے نئے خواب دکھائے۔ ترک عوام نے جمہوری اصلاحات اور آمریت مخالفانہ تقریروں کو مسترد کر کے خوشحالی، ترقی کے ماڈل کو ووٹ ڈالا اور بتا دیا کہ عام آدمی کیا چاہتا ہے۔ پاکستان میں بہت لوگوں نے طیب ایردوان کی کامیابی کا جشن منایا، ہمارے ہاں کے لبرل حلقے اس پر چیں بہ چیں ہوتے رہے ہیں، اس کی نفسیاتی وجوہات پر آئندہ بات کریں گے اور یہ بھی کہ پاکستان میں یہ ماڈل کس طرح دہرایا جاسکتا ہے؟

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی ۔ ۲۶ جون ۲۰۱۸ء)

ترک صدارتی انتخابات ۲۰۱۸ء کے نتائج

امیدوار	ووٹ	فی صد
رجب طیب ایردوان	۲۶،۳۴۴،۴۸۲	۵۲،۶
محرم انجے	۱۵،۲۳۷،۵۹۴	۳۰،۷
صلاح الدین دیمرتاش	۴،۱۰۵،۲۱۹	۸،۴
میرل آقشنر	۳،۶۴۹،۳۳۴	۷،۳
[illegible]	۳۳۳،۷۶۶	۰،۹
[illegible]	۹۸،۵۲۶	۰،۲

رواں صدی میں امریکا کا سب سے بڑا دھوکا!

رابرٹ فسک

یہ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی بے وفائی ہوگی اور اس دغا بازی کو صدیوں یاد رکھا جائے گا۔ امریکا نے جنوب مشرقی شام میں اسد حکومت کے خلاف برسرپیکار باغیوں کو واضح پیغام دیا ہے کہ وہ اب مغرب سے اسد حکومت کے خاتمے کے لیے مزید مدد کی توقع نہ رکھیں۔ اس امریکی اقدام کو شام کی خانہ جنگی کا ٹرننگ پوائنٹ اور فری سیرین آرمی کے ساتھ شرمناک دھوکہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ درعا شہر پر شام کی فوج کے قبضہ کی صورت میں امریکی نواز باغیوں کے تباہ کن انجام کے بعد اسد حکومت باغیوں سے پورے شام کا قبضہ واپس لینے کے لیے پورے عزم سے لڑنے کے لیے تیار ہوگی۔ گزشتہ ہفتے درعا، قنطیرہ اور السویدا شہروں میں باغیوں نے جب اسد حکومت سے امن مذاکرات کرنے سے انکار کیا تو روس نے میزائل حملے کیے بعد میں شام کی فضائیہ نے بمباری شروع کردی، جس کے بعد ان علاقوں سے شہریوں نے ہجرت شروع کردی۔ رائٹر کے مطابق امریکا کی جانب سے انکار مایوسی اور ناامیدی کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ امریکا نے واضح الفاظ میں پیغام دیا ہے اب آپ امریکی فوج کی مداخلت کی توقع رکھے بغیر اپنے فیصلے کریں۔ ہمیں آپ کے مسائل کا بخوبی ادراک ہے۔ اس لیے امریکا روس اور شام کی افواج کو بھی مشورہ دے گا کہ وہ خطہ میں تناؤ کم کرنے کے لیے آپ کے علاقوں میں جنگ بندی کی خلاف ورزی نہ کریں۔ جب واشنگٹن کی طرف سے یہ الفاظ استعمال کیے جائیں گے کہ امریکا کو اپنے اتحادیوں کی مشکلات کا اندازہ ہے اور یہ کہے گا کہ امریکا کا مشورہ ہے کہ روس اور شام بھی جنگ بندی کی خلاف ورزی نہ کریں تو کیا یہ روس کی بھی پہلی خواہش نہ ہوگی کہ امریکا ایسی ہی بات کہے۔ کیا آپ کو اس بات کا ذرہ بھر بھی اندازہ ہے کہ آپ کے یہ الفاظ آپ کے اپنے ہی اتحادیوں کے پاؤں تلے سے زمین کھینچنے کے مترادف ہیں لیکن امریکا کو یہ احساس بھی ہے کہ اس نے النصرہ پر اربوں ڈالر تربیت اور ہتھیاروں کی فراہمی پر صرف کیے مگر اسلحہ بدنام زمانہ القاعدہ کے جنگجوؤں تک پہنچ گیا اور اسی سرمایہ سے جنگجوؤں نے اس علاقہ کا قبضہ شام کے جمہوریت پسندوں سے لیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۷۰ ہزار پونڈ تو ڈیوڈ کیمرون نے دیے تھے۔ ان علاقوں میں حزب اللہ اور ایران کے چند پاسداران انقلاب کو بھی جرأت نہ تھی کہ وہ اس علاقہ میں جنگجوؤں کا سامنا کرسکیں اور یہ کام امریکا اور روس کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ بعد میں یہ فیصلہ ہوا کہ اس علاقے میں شام اور روس کی فوج مل کر حملہ کرے گی۔ یہ منصوبہ ولادی میر پیوٹن کے علاوہ جس ذہن کی بھی پیداوار تھا اس نے صدر ٹرمپ کی وساطت سے اسرائیل کو یہ گارنٹی دی تھی کہ اس علاقے کے شام کے کنٹرول میں جانے کے باوجود بھی اسرائیل کے شام کی گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا جس کے بعد عمان میں نام نہاد ملٹری آپریشن سنٹر نے بھی اپنا کام بند کردیا، جو اردن کی سرحد کے قریب باغیوں کی مدد کررہا تھا، مگر اب ایسا نہیں کر رہا۔ یہاں تک کہ اسرائیل جو شام میں القاعدہ اور اسلامی شدت پسندوں پر حملوں کی بجائے ایران اور اسد فوج پر حملے کررہا تھا، امریکا کے مایوس ہونے اور شام میں اسد حکومت کے اسلحہ کے زور پر خاتمہ کے منصوبہ کو ترک کرنے کے بعد امریکا نے اسرائیل کو بھی یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ شام میں اسد فوج اور ایران کے پاسداران انقلاب پر حملوں سے باز آجائے تو امریکا گولان کی پہاڑیوں پر اسرائیل کے قبضہ برقرار رہنے کی گارنٹی دینے کے لیے تیار ہے۔ اس لیے اسرائیل کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ شام اور ایران سے جنگ کا خطرہ مول لینے کی بجائے اقوام متحدہ کے بفرزون کو تسلیم کرلے۔ دمشق میں حکومت مخالف باغیوں کے مطابق جب چار برس پہلے ملٹری آپریشن سنٹر نے شام کے تمام باغیوں کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیا تھا اس وقت دمشق میں جنگ جاری تھی اور باغیوں نے بشارالاسد کے محل پر حملہ کے لیے مارٹر گولوں اور آرٹلری سے مدد کا مطالبہ کیا تھا تو اس وقت بھی ایک برطانوی میجر اور سعودی افسر نے صرف چھوٹے ہتھیار فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا جو اس وقت بھی ایک اشارہ تھا، اسی قسم کے حالات کا سامنا شمالی شام میں کردوں کو بھی رہا ہے۔ امریکا اس طرح کا پیٹھ میں چھرا پہلے بھی دو مرتبہ گھونپ چکا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں جب امریکا نے شاہ ایران اور صدام حسین کے درمیان معاہدہ کروادیا تو کسنجر نے سی آئی اے کے فنڈز میں ۱۶ ملین پونڈ کی کٹوتی کر کے صدام حسین کے لیے کردوں کو کچلنے کی ہموار کی تھی جس کے بعد امریکیوں نے ۱۹۹۱ء میں صدام حسین کو کردوں کو تباہ کرتے ہوئے بھی خاموشی سے دیکھا تھا جبکہ امریکا نے کویت پر صدام کا قبضہ ختم کروانے کے لیے کردوں کو استعمال کیا تھا۔ شام کو یہ خوف بھی ہے کہ اسرائیل گولان کی پہاڑیوں کے نیچے اپنا بفرزون قائم کرسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اسرائیل نے جنوبی لبنان میں اسلحہ کے زور پر خودساختہ بفرزون بنایا تھا جو ۲۲ ماہ تک قائم رہا۔ مگر بعد میں اسرائیل کی حمایت یافتہ لبنانی ملیشیا کا شیرازہ بکھر گیا۔ کیونکہ جنوبی لبنان کی اسرائیل نواز ملیشیا ناقابل بھروسہ اور صلاحیتوں سے عاری تھی اور بعد میں افسانہ ثابت ہوئی۔ ۲۰۰۰ء کی طرح اب کی بار سیرین فری آرمی کے ساتھ بھی وہی سلوک ہونے جارہا ہے۔ شام کے نقشہ پر جتنا بھی ہنگامہ تھا وہ مغرب کی قوت کے بل بوتے پر تھا۔ جواب اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ اگر امریکا اور اس کے اتحادی جنوبی اور شمالی شام میں اپنے اتحادیوں کی مدد سے ہاتھ کھینچنے کا فیصلہ کرچکے ہیں تو یہ روس اور اسد کی فتح ہوگی۔ باغیوں کی ترکی کی سرحد پر یا پھر درعا میں جو باقیات بچی ہیں ان کو امریکا کا ہتھیار پھینکنے کا مشورہ ہی بہتر ہوگا کیونکہ ایسا کرنے سے کم از کم امریکا یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ ایران کو اسرائیل سے دور رکھنے میں کامیاب ہوگیا ہے مگر اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ واشنگٹن اور نیٹو نے اسد حکومت کے خاتمے کا فیصلہ ترک کردیا ہے۔

(ترجمہ: ذوالفقار چودھری)

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۳۰ جون ۲۰۱۸ء)

بقیہ: اسرائیل۔ فلسطین: نئے معاہدے کی کوششیں

تعاون ختم کردیں۔ اسی طرح اردن کو راضی کرنا بھی ایک مشکل کام ہے۔ وہاں کی قیادت کے ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں، کیوں کہ وہاں کی عوام ایسے کسی بھی معاہدے کو یکسر مسترد کرچکی ہے۔ چاہے اس کے بدلے میں انھیں واشنگٹن کی طرف سے دھمکیاں ملیں یا مالی امداد۔

عمان کے لیے ایسے حالات میں اسرائیل اور فلسطین کے معاملے پر عوام کی مرضی کو نظرانداز اتنا آسان نہیں ہوگا جب وہاں کے عوام نے حال ہی میں احتجاجی مظاہروں کے ذریعے حکومت کو گھر جانے پر مجبور کردیا تھا۔ یہ تمام واقعات اور حالات اس بات کا اشارہ دے رہے ہیں اس ڈیل کو بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بدقسمتی سے اس سارے عمل کے دوران مستقبل میں ہونے والے کسی قانونی معاہدے کو بھی شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

(مصنف دوحہ انسٹی ٹیوٹ، قطر میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں)

"What is behind Jared Kushner's latest Middle East tour?" ("aljazeera.com". June 25, 2018)

غزہ: احتجاج کے سوا کچھ کرنے کو نہیں!

سرجن ''مازن قصاص'' ایک مریض کی زخمی ٹانگ کا معائنہ کر رہے تھے، جس کو اسنا پر سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ حالانکہ مازن قصاص کو ۱۲ گھنٹے کی ڈیوٹی دینے کے بعد اس وقت آرام کے لیے اپنے بستر پر ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ زخمیوں کے علاج کے لیے واپس اسپتال آگئے تھے۔ یہ گزشتہ چار برس میں غزہ کا بدترین خونی دن تھا، اسپتال میں گنجائش سے کہیں زیادہ زخمی علاج کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے ایک زخمی کی پٹی اتاری تو انتہائی بڑا اور گہرا زخم سامنے آگیا، یہ اسنا پر کی گولی کا زخم تھا۔ وہ نرس کو ہدایت دے کر آگے بڑھ گئے۔ مازن کا ۵۰ اور مریض بھی انتظار کر رہے تھے۔ ''گزشتہ روز جنگ کا بدترین دن تھا، مریضوں کا سارا رش ایک ہی وقت میں آگیا''۔ ۱۴ مئی کو ہزاروں فلسطینیوں نے غزہ اور اسرائیل کی سرحد پر احتجاج میں حصہ لیا۔ یہ ''گھر واپسی عظیم مارچ'' کا چھٹا ہفتہ تھا، اس مارچ کا مقصد فلسطینیوں کی ان گھروں کو واپسی ہے جہاں وہ اسرائیل کے قیام سے قبل رہائش پذیر تھے۔ کشیدگی کے اس موقع پر ہی امریکی سفارتخانے کی بیت المقدس منتقلی کی شکل میں ایک اور تنازعے نے جنم لیا، جو فلسطینیوں کے مطابق ان کے ساتھ ایک اور ناانصافی ہے۔ غزہ اور اسرائیل کے درمیان سرحد کو کچھ جگہوں پر کنکریٹ کی دیوار سے بند کیا گیا ہے، جبکہ دیواروں پر خودکار مشین گنز بھی نصب ہیں۔ سرحد کے دیگر حصوں کو لوہے کی باڑ لگا کر بند کیا گیا ہے، چند مظاہرین اس باڑ کو ہی پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، زیادہ تر مظاہرین اس باڑ کے پاس کھلے میدان میں احتجاج کرتے ہیں۔ جہاں لاؤڈ اسپیکر پر نغمے بج رہے ہوتے ہیں اور دکانوں پر سینڈوچ کی فروخت جاری رہتی ہے، ایک شخص کا کہنا تھا کہ ''لوگ یہاں دوسرے لوگوں کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ مظاہرین مشرقی غزہ کے علاقے Malaka میں جمع ہوجاتے ہیں، وہ ٹائر جلاتے یا باڑ کاٹ کر اسے پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کے بعد مظاہرین میں سے بہت سارے اسٹریچر پر واپس آتے ہیں۔ اسرائیل کی جانب سے فلسطینیوں پر آنسو گیس پھینکی جاتی ہے تو غزہ کی طرف سے پتنگوں کے ذریعے پٹرول بم پھینکے جاتے ہیں، جس کا مقصد اسرائیلی کھیتوں کو آگ لگانا ہوتا ہے۔ اس دوران اسنا پر سے گولی چلنے کی آوازوں کے ساتھ ایمبولینس کا سائرن سنائی دیتا رہتا ہے۔ غزہ کی وزارت صحت کے مطابق اگلی صبح تک مرنے والوں کی تعداد ۶۰ اور زخمیوں کی تعداد ۲۷۰۰ تک پہنچ چکی تھی۔

فلسطینیوں کے مارچ کے خلاف کارروائی نے اسرائیل کو بدنام کر دیا ہے، بہت سے ممالک نے اسرائیل کو طاقت کے بے جا استعمال کا ذمہ دار قرار دیا۔ اس احتجاج کے دوران کوئی اسرائیلی نہیں مارا گیا اور چند افراد ہی زخمی ہوئے۔ احتجاج کرنے والے بیشتر لوگ غیر مسلح تھے، کچھ مظاہرین کے پاس غلیل اور پٹرول بم تھے مگر ۱۰۰ میٹر دور کھڑے اسرائیلی فوجیوں کو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ باڑ کے قریب نہ جانے والے مظاہرین بھی زخمی ہوئے، ایک لڑکا باڑ سے ۱۰۰ میٹر دور راستے پر چلتا ہوا گولی کا نشانہ بن گیا۔

اسرائیلی فوج کا بیان میں کہنا تھا کہ فلسطینیوں کے خلاف کارروائی اپنی سرحد کو محفوظ کرنے کے لیے جائز اور مناسب اقدام ہے۔ سرحد پر موجود اہلکار پہلے مظاہرین کو آنسو گیس کے ذریعے منتشر کرتے ہیں، لیکن کھلے علاقے میں آنسو گیس غیر موثر ہوتی ہے۔ زیادہ تر زخمیوں کو ٹانگ پر گولی ماری گئی ہے، (یعنی قتل نہیں کیا) کچھ زخمی مناسب طبی سہولت نہ ملنے کی وجہ سے مارے گئے۔ اس دوران عسکریت پسندوں نے باڑ کے قریب دھماکا خیز مواد نصب کرنے کی کئی مرتبہ کوشش کی۔ حماس کا کہنا ہے کہ شہید ہونے والے اکثر فلسطینیوں کا تعلق حماس سے ہے۔

اسرائیل کو ان چند مظاہرین سے پریشانی نہیں، لیکن اصل خطرہ یہ ہے کہ اگر ۲۰ لاکھ افراد نے باڑ پار کرنے کی کوشش کی تو ان کو روکنے کے لیے پوری فوج بھی کم پڑے گی۔ اس لیے خوف کے ذریعے فلسطینیوں کو قابو کیا جائے، اور یقین دلایا جائے کہ یہ باڑ ناقابل عبور سرحد ہے۔ دوسری جانب مظاہرین بالکل بے خوف ہوگئے ہیں، کچھ نوجوان مظاہرین نے حیرت انگیز بہادری کا مظاہرہ کیا اور وہ اتنا قریب چلے گئے کہ آج سے پہلے کبھی نہ گئے تھے۔

اگرچہ اسرائیلی فائرنگ سے خوف کی فضا قائم ہوئی مگر مختصر عرصے کے لیے، ہزاروں راؤنڈ فائر کر کے مجمع کو روکا تو جاسکتا ہے، مگر اس سے اس تنازعے کے حل میں کوئی مدد نہیں ملے گی جس کی وجہ سے مظاہرین باڑ کے قریب جمع ہوئے۔

اگر غزہ کا محاصرہ جاری رہتا ہے تو مظاہرین ضرور دوبارہ یہ کوشش کریں گے۔ ۱۴ مئی کے پرتشدد واقعات کے بعد سے غزہ ''وارزون'' کے طور پر مشہور ہوگیا ہے۔ غزہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ۲۰ لاکھ لوگ محصور ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں حماس کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سے اسرائیل اور مصر نے اس علاقے کا محاصرہ کر رکھا ہے۔

فوری طبی امداد اور کچھ تاجروں کے اسرائیل آنے جانے کے لیے Erez کے مقام پر ایک کراسنگ کھلی ہے۔ زیادہ تر غزہ کے رہائشی مصر کی سرحد پر واقع رفاہ کراسنگ استعمال کرتے ہیں۔ مگر ۲۰۱۵ء کے بعد سے رفاہ کراسنگ کو صرف ۱۲۹ دن کھولا گیا ہے، یعنی پورے سال میں صرف ساڑھے پانچ ہفتے رفاہ کراسنگ کھولی گئی۔ اور یہاں سے صرف ۶۳ ہزار افراد ہی مصر جاسکے، اب زیادہ تر زیر زمین سرنگوں کو بند کر دیا گیا ہے، غزہ میں ہر آدمی پھنس کر رہ گیا ہے۔

رفاہ سرحد بند ہے اور دوسری سرحد سے اسرائیل نے اشیا کی آمدورفت پر سخت پابندی لگا رکھی ہے۔ اسرائیل کی ''کریم شلون مارکیٹ'' میں غزہ کا سامان، پھل اور فرنیچر دہائیوں سے فروخت کیا جا رہا تھا، یہ مارکیٹ اب بند پڑی ہے۔ جس کا نتیجہ غزہ میں خالی کارخانوں، زنگ آلود مشینوں اور بے روزگاری کی شکل میں نکلا۔ غزہ میں ہر پانچ میں سے دو نوجوان بے روزگار ہیں۔ کئی خاندان بنیادی اشیا بھی خریدنے کے قابل نہیں رہے ہیں، ان کا گزارا مکمل طور پر امداد پر ہوتا ہے۔ عدم توجہی اور اسرائیلی بمباری نے علاقے کا انفرااسٹرکچر تباہ کر دیا ہے۔ علاقے میں گندے پانی کو ٹھکانے لگانے کا کوئی بندوبست نہیں ہے، گندے پانی کو یا تو کھلے تالابوں میں جمع کیا جاتا ہے یا پھر بحیرہ روم میں پھینک دیا جاتا ہے، گندے اور سمندری پانی نے غزہ میں زیر زمین پانی کو خراب کر دیا ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق غزہ میں موجود زیادہ تر پانی انسانی صحت کے لیے خطرناک ہے۔ غزہ کے شہریوں کو دن میں صرف تین گھنٹے کے لیے بجلی میسر آتی ہے۔ بجلی آنے کے اوقات بھی عجیب ہیں، غزہ کے لوگ رات میں جاگ کر کپڑے دھونے اور اپنے موبائل چارج کرنے کے عادی ہیں، جبکہ بچے موم بتی کی روشنی میں پڑھائی کرتے ہیں۔

ان حالات سے مایوس ہو کر مجاہد ابوشعیب گزشتہ ماہ احتجاج میں شامل ہوا۔ وہ گزشتہ سال ماربل فیکٹری کی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ مجاہد کے پاس اپنا خاندان کو آگے بڑھانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ مجاہد کا کہنا تھا کہ میں

اکتا گیا تھا اور ''گھر واپسی مارچ'' ایک نئی چیز تھی۔ مجاہد اسپتال میں زیرِ علاج ہے، گولی لگنے کے باعث اس کی ٹانگ سوج کر سیاہ پڑ چکی ہے، ڈاکٹروں کو خدشہ ہے کہ ٹانگ کاٹنی پڑ سکتی ہے، ایک بہتر اسپتال میں اس نقصان سے بچا جاسکتا تھا، لیکن مجاہد کو اسرائیل جا کر علاج کرانے کی اجازت نہیں ہے۔ غزہ میں رہنے والوں کی اکثریت پناہ گزینوں کی ہے، جو کئی نسلوں سے یہاں آباد ہیں اور مغربی کنارے میں رہنے والے فلسطینیوں سے غریب ہیں۔

غزہ، ماضی میں بھی شدید مصائب کا شکار رہا ہے۔ بیسوی صدی میں غزہ ترکی، برطانیہ اور مصر کے ہاتھ میں رہا، یہاں تک کی ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے قبضہ کرلیا۔ ۱۹۹۳ء میں اوسلو امن معاہدے کے بعد فلسطینی اتھارٹی نے جنم لیا، جس کو اسرائیل کے زیرِ قبضہ علاقوں میں محدود خودمختاری دی گئی۔ اسرائیل نے غزہ سے فوجیوں کو واپس بلا لیا، سوائے ان فوجی اڈوں اور علاقوں کے جنہیں استثنا دیا گیا تھا۔

۲۰۰۰ء میں دوسرے انتفادہ کے دوران شدید خونی لڑائی کے بعد اس معاہدے کو برقرار رکھنا مشکل ہوگیا۔ ۲۰۰۵ء میں سخت گیر اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون نے غزہ کو مکمل طور پر خالی کردیا، دن بدن فلسطینی اتھارٹی کا کنٹرول بڑھتا گیا مگر زیادہ عرصے کے لیے نہیں۔ الفتح پارٹی کے بانی اور فلسطینی اتھارٹی کے سربراہ یاسر عرفات نے غزہ کو اپنا مرکز بنایا۔ اسرائیل کے انخلا اور ۲۰۰۴ء میں یاسر عرفات کی موت نے غزہ پر حماس کے قبضے کو آسان بنادیا۔ جنوری ۲۰۰۶ء میں فلسطین میں نئی پارلیمان کے لیے انتخابات ہوئے، جس کے نتیجے میں حماس نے حیران کن فتح حاصل کی۔ فلسطینیوں نے الفتح کی سابق حکومت کے خلاف غصے کا اظہار کیا تھا۔ جس کے بعد فلسطینی تحریک دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، الفتح نے اتحادی حکومت کا حصہ بننے سے انکار کردیا، مہینوں تک دونوں جماعتوں میں تصادم جاری رہا۔ بالآخر جون ۲۰۰۷ء میں ایک ہفتے کی شدید جنگ کے بعد حماس نے غزہ کا انتظام سنبھال لیا۔ لیکن پھر غزہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔

۲۰۰۷ء سے اسرائیل غزہ میں حماس اور دیگر مسلح گروپوں سے تین جنگیں لڑ چکا ہے۔ آخری خونریز جنگ ۲۰۱۴ء کی گرمیوں میں ہوئی، جو ۵۱ دن تک جاری رہی، جس میں شدید اسرائیلی بمباری کے نتیجے میں ۲۰۰۰ ہزار سے زائد افراد مارے گئے اور ایک لاکھ بے گھر ہوگئے، مرنے والوں کی اکثریت عام شہریوں کی تھی۔ حماس نے جنگ کے اختتام پر فتح کا جشن منایا کیوں کہ وہ اپنا دفاع کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ جس کے بعد اسرائیل کا خوف یقین میں بدل گیا کہ فلسطینیوں کو مغربی کنارے میں ایک ریاست دے دی تو وہ اس کو تل ابیب پر راکٹ حملوں کے لیے استعمال کریں گے۔ اخوان المسلمون کی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والے مصری صدر ابوالفتح السیسی کا شمار بھی حماس کے دشمنوں میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ حماس نے اخوان المسلمون کی ذیلی تنظیم کے طور پر جنم لیا تھا۔ صدر سیسی حماس پر سینا میں جہادیوں کی مدد کرنے کا الزام لگاتے ہیں، ان کے دعوے میں کچھ سچائی بھی ہے۔ حماس نے مصری عسکریت پسندوں کو غزہ میں داخل ہونے اور پناہ حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔

غزہ مشرق وسطیٰ میں تنازعات کو بڑھانے کا سبب بن رہا ہے۔ قطر طویل عرصے سے حماس کے قریب ہے اور غزہ کی مدد کرتا رہا ہے۔ قطر نے ۲۰۱۴ء کی جنگ کے بعد سڑکوں اور گھروں کی تعمیر کے لیے ایک ارب ڈالر کی امداد دی۔ لیکن اسلام پسندوں کی حمایت کی سزا کے طور پر قطر کو چار عرب ریاستوں کی جانب سے پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قطر کے پڑوسی ملک عرب امارات نے غزہ میں اس کی جگہ لینے کی کوشش کی، جس کے بعد قطر نے دوبارہ سے اسلام پسندوں کی حمایت شروع کردی ہے، جس میں حماس بھی شامل ہے۔

غزہ کے رہائشی زیادہ تر اپنی مصیبت کا ذمہ دار دیگر فلسطینیوں کو قرار دیتے ہیں، حماس اور الفتح کے درمیان چھ معاہدے محض ردی کا ڈھیر ثابت ہوئے۔ گزشتہ برس مغربی کنارے میں موجود فلسطینی صدر محمود عباس نے غزہ پر پابندیاں لگاتے ہوئے دواؤں کی ترسیل کے ساتھ بجلی کی رقم کی ادائیگی روک دی۔ گزشتہ اکتوبر میں حماس اور الفتح کے درمیان قاہرہ میں ایک اور معاہدے پر دستخط ہوئے، جس میں غزہ کا انتظام فلسطینی اتھارٹی کے حوالے کرنے پر اتفاق کیا گیا۔ حماس اسکول اور صفائی کا انتظام حوالے کرنے پر خوش تھی کہ کسی کو تو خراب حالات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکے گا، لیکن اس نے سیکیورٹی فورسز کا انتظام حوالے کرنے سے انکار کردیا اور ہتھیاروں میں صرف راکٹ حوالے کرنے کی حامی بھری تھی۔ معاہدے کے موثر ہونے کے بعد فلسطینی اتھارٹی کے اہلکاروں نے Erez میں حماس کی چوکی کا انتظام سنبھال لیا اور حماس کے لوگ قریبی علاقے میں منتقل ہوگئے۔ لیکن باہر سے آنے والوں کے لیے اب بھی حماس سے اجازت لینا اور اس کی خفیہ پولیس کے عجیب سوالات کا جواب دینا ضروری تھا۔

اسرائیلی عام طور پر اصرار کرتے ہیں کہ ۲۰۰۵ء میں غزہ خالی کرنے کے بعد سے وہاں کے خراب حالات ان کا مسئلہ نہیں ہیں۔ پریشانی ضرور ہے مگر بہت کم ہی اس کا اسرائیلیوں کی روزمرہ کی زندگی پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ اسرائیلی موقف جھوٹ پر مبنی ہے۔ اسرائیل اب بھی غزہ میں پوری طرح متحرک ہے۔ غزہ کا ساحل اور غزہ کی فضا اب بھی اسرائیلی فوجیوں کے قبضے میں ہے۔ اسرائیل ہی فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے ماہی گیر سمندر میں کہاں تک جاسکتے ہیں، غزہ کے رہائشی کن علاقوں میں تھری جی سروس استعمال کرسکتے ہیں۔ اسرائیل غزہ کے آبادی رجسٹر کی نگرانی کرتا ہے، جس میں غزہ میں پیدا ہونے والے ہر بچے کی معلومات ہوتی ہیں۔ غزہ سے سمندر میں پھینکا جانے والا گندا پانی اسرائیلی سرحدوں پر صاف کیا جاتا ہے۔ کئی برسوں سے اسرائیلی حکام حالات کو بہتر کرنے کے لیے طریقے پیش کرتے رہے ہیں، انہوں نے انفرا اسٹرکچر کے منصوبوں کی تجویز پیش کی اور ہزاروں مزدوروں کو اسرائیل آکر کام کرنے کی پیشکش کی، مگر کوئی بھی سنجیدہ نہیں ہوا۔ اسرائیلی پارلیمان میں غزہ کی حمایت بہت کم ہے، خاص کر نیتن یاہو کی دائیں بازوں کی حکومت میں تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ غزہ کا محاصرہ ختم کرنے سے حالات بہتر ہوسکتے ہیں مگر ریاست سے محروم غزہ کے رہائشیوں کا غصہ کم نہیں ہوگا۔ حماس طاقت کے ذریعے حالات تبدیل نہیں کرسکتی، اس کے ہتھیار مشرق وسطیٰ کی سب سے طاقتور فوج کے لیے خطرہ نہیں۔ حماس کو خوف ہے کہ ہتھیار کھونے کا مطلب اپنی شناخت کھونا ہوگا، کچھ حکام مذاق میں کہتے ہیں کہ حماس ڈاڑھی والی فتح میں تبدیل ہوچکی ہے۔ بہت سارے غزہ کے رہائشیوں کو شکایت ہے کہ حماس نے لڑائی کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب زیادہ تر وقت ہتھیاروں کا استعمال نہیں کیا جاتا۔

احتجاج کے دوران شہید بچے کی ماں کا کہنا تھا کہ ''حماس مزاحمت کی بات تو کرتی ہے، لیکن اسرائیل سے لڑتے صرف ہاتھوں میں پتھر لیے یہ نوجوان ہیں''۔ حالیہ مہینوں میں حماس نے پرامن مزاحمت کی حمایت کی ہے، سیاسی تشدد کی شناخت رکھنے والے گروپ کی جانب سے یہ ایک بڑا قدم تھا۔ مسلح مزاحمت کا عزم حماس کے چارٹر میں تحریری شکل میں موجود ہے۔ اس موقف نے حماس کو عجیب صورتحال میں پھنسا دیا۔ مقامی کارکن تو احتجاج کی خواہش رکھتا ہے، اس لیے حماس نے فوری طور پر اس خواہش کو اپنایا، اس نے احتجاج کی حمایت

میں پیغامات بھیجے اور بسوں کے ذریعے مظاہرین کو سرحد پر پہنچایا۔حماس کے رہنما یحییٰ سنوار کا کہنا ہے کہ ''جنگلی شیر کو ۱۱ برس تک قید اور بھوکا رکھا گیا مگر اب وہ آزاد ہے''۔اس سے قبل انہوں نے اسرائیل کو تنبیہ کی کہ ''ہم سرحد کو روند ڈالیں گے، اور ان کی لاشوں سے دل نکال لیں گے''۔ تازہ ترین خونریزی کے بعد حماس کے رہنماؤں کو خدشہ ہے کہ وہ شیر کا کنٹرول کھو دیں گے۔اسلامک جہاد کے تحت چلنے والے ایک ریڈیو اسٹیشن کے میزبان نے اپنے کمانڈرز سے سخت جوابی کارروائی کی اپیل کی۔اس دوران اسرائیل نے فضائی حملے بھی کیے،ایک فوجی ترجمان نے دھمکی بھی دی کہ اگر احتجاج جاری رہا تو مزید حملے کیے جائیں گے،اسرائیل نے غزہ کے گرد کارروائی کے لیے تعینات فوجی اہلکاروں کی تعداد کو دو گنا کردیا، ایسے میں جنگ کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، جس کو برداشت کرنے کی صلاحیت غزہ میں نہیں ہے۔شدید خونریزی کے بعد حماس پیچھے ہٹ گئی،شدید تصادم کے اگلے دن مئی ۵ کو احتجاج کا اختتام ہوگیا۔

''یوم نکبہ'' (۷۰ برس قبل فلسطینیوں کی بڑے پیمانے پر بے دخلی کا دن) کے موقع پر چند سو افراد نے احتجاج میں شرکت کی اور کچھ ہی لوگوں نے باڑ تک جانے کی کوشش کی۔ایک شخص نے عام استعمال کا چاقو اٹھا کر اسرائیلی فوجی کو لڑنے کا چیلنج دیا،ایک اور شخص نے استعمال شدہ ٹن پیک کا لاؤڈ اسپیکر بنالیا اور عبرانی زبان کا مذاق اڑانے لگا،حقیقت میں یکجہتی کا جذبہ ختم ہو چکا تھا۔

مصطفیٰ مرتضیٰ اسپتال میں زیر علاج ہے،اس کے کمرے میں کافی رش ہے،انہوں نے مایوس ہو کر احتجاج میں شرکت کی، جس دوران گولی ان کی ٹانگ پر لگی،ان کا زخم معمولی نوعیت کا ہے۔لیکن وہ خوف زدہ ہے کہ ٹانگ ٹھیک ہونے میں ہفتوں لگیں گے اور اس دوران وہ پولٹری فارم کی نوکری سے فارغ ہوسکتا ہے،جیسا کے پولٹری فارم کے مالک نے ان کو مختصر مدت کے لیے فارغ کرنے کی بات کی تھی۔ان کے پاس کچھ نہیں سوائے تاریک مستقبل کے،مصطفیٰ اور ان جیسے دیگر لوگوں کے پاس ایسا کچھ نہیں کہ وہ ان مظاہروں سے دور رہیں۔مصطفیٰ کا کہنا تھا کہ ''میں واپس آؤں گا اور دوبارہ احتجاج کروں گا،یہ ایک چیلنج ہے،ایک نوجوان کے طور پر میں اور کیا خواہش رکھ سکتا ہوں''۔ (ترجمہ:سید طالوت اختر)

"Siege mentality deadly protests on Gaza's border with Israel". ("The Economist". May 17, 2018)

امریکا کو غصہ کیوں آتا ہے؟

پانچویں قسط

غیر معمولی مستقبل کی تلاش

محمد ابراہیم خان

اب تک یہ بات واضح ہوچکی ہوگی کہ عالمگیر حکمرانی کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے امریکا کی فوج اور کاروباری طبقے نے ہمیشہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کام کیا ہے۔ امریکی تاجر وصنعت کار چاہتے تھے کہ اُنہیں کام کرنے کے لیے آسان منڈیاں مل جائیں جہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق منافع وصول کرسکیں۔ امریکی فوج نے اُن کا یہ کام کردیا۔ جواب میں کاروباری طبقے نے بھی فوج کی بلند تنخواہوں کے ساتھ ساتھ وہ تمام سہولتیں یقینی بنائیں جن کی مدد سے وہ اپنی طاقت برقرار رکھنے میں دِقّت محسوس نہ کریں۔

امریکا کی سیاسی قیادت نے عسکری قیادت کے ساتھ مل کر کاروباری طبقے کے مفادات کو بھرپور تحفظ فراہم کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اِس کے جواب میں کاروباری طبقے نے بھی سیاست دانوں اور عسکری اداروں کو کُھل کر کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔یعنی جب امریکا نے عالمگیر حکمرانی کا خواب دیکھنا شروع کیا تب ہی سے یہ طے ہوگیا کہ سیاست دان، فوجی اور کاروباری افراد مل کر کام کریں گے۔

۱۹۱۰ء میں امریکی صدر ولیم ہاورڈ ٹیفٹ نے کہا۔ ''امریکی صنعت کاروں اور تاجروں کے لیے زیادہ سے زیادہ منافع یقینی بنانے کے حوالے سے میں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی''۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ امریکی سیاسی قیادت تو کاروباری طبقے کے لیے زیادہ سے زیادہ منافع یقینی بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتی اور اُسے اِس کے عِوض کچھ بھی نہ ملتا۔امریکی صدر کے یہ الفاظ اِس امر کے غمّاز ہیں کہ امریکی سیاسی وعسکری قیادت اور کاروباری طبقہ ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کے مفادات کے محافظ رہے ہیں۔ امریکی تاجروں اور صنعت کاروں کو جب کبھی بیرونی منڈیوں میں ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے، امریکی فوج نے آگے بڑھ کر اُن کا مسئلہ حل کیا ہے۔اور اِس معاملے میں سیاسی قیادت نے بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ امریکی سیاسی جماعتوں، ملٹری اسٹیبلشمنٹ اور کاروباری اداروں کے مفادات کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔تینوں نے ہمیشہ مل کر کام کرنے کو ترجیح دی ہے کیونکہ ایسا کرنے کی صورت ہی میں وہ زیادہ فوائد بٹورنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اِس مقام پر ہم اِس نکتے کو نظر انداز نہیں کرسکتے کہ پہلی جنگِ عظیم دراصل دُنیا بھر کے قدرتی وسائل اور خِطّوں کو آپس میں تقسیم کرنے کے حوالے سے یورپ کی استعماری قوتوں کی ہوس کا نتیجہ تھی۔ امریکا نے بھی اِس جنگ میں حصہ لیا مگر امریکی سیاسی قیادت نے عوام سے جھوٹ بولا۔ اُس وقت کے صدر وڈرو ولسن نے پہلی جنگِ عظیم کے لیے فوج روانہ کرتے ہوئے عوام کو بتایا کہ اِس اقدام کا بنیادی مقصد دُنیا کو جمہوریت کے لیے زیادہ محفوظ بنانا ہے!

عوام سمجھ گئے کہ ایک بار پھر اُن سے جھوٹ ہی بولا جارہا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ امریکی صدر دراصل یورپی قوتوں کی بندر بانٹ میں اپنا حصہ تلاش کررہے تھے۔

برطانیہ میں متعیّن امریکی سفیر ڈبلیو ایچ پیج نے ۱۹۱۷ء میں دوٹوک الفاظ میں کہا۔''امریکا کے کاروباری مفادات کو تحفظ فراہم کرنے اور اُنہیں برقرار رکھنے کے لیے ایک یہی بہترین طریقہ رہ گیا ہے کہ جنگ میں حصہ لیا جائے اور اپنا حصہ یقینی بنالیا جائے''۔

ملک کے کاروباری مفادات کو تحفظ کرنے کے نام پر پہلی جنگِ عظیم میں ایک لاکھ ۳۰ ہزار سے زائد فوجیوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

جنرل اسمیڈلی بٹلر نے ۱۹۳۴ء میں بتایا ''ہم جب امریکی فوجیوں کو بیرونِ ملک مہمّات کے لیے بھیجتے تھے تو اُن

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ نئی کتاب

زندگی کے عام فقہی مسائل

(جلد سوم)

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

قیمت: ۲۵۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5

فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

کے ذہنوں میں بہت بُلند آدرش ہوا کرتے تھے۔ اُن کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی جاتی تھی کہ دُنیا وحشی ہے جسے تہذیب سکھانے کے لیے لازم ہے کہ امریکا طاقت استعمال کرے اور اُنہیں 'راہِ راست' پر لائے۔ اُن کے ذہنوں میں بہت دُور تک یہ بات نہیں ہوتی تھی کہ وہ بیرون ملک عسکری مہمّات میں امریکی کاروباری طبقے کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی خاطر جان دیں گے!'' یعنی عوام کے ساتھ ساتھ امریکی فوجیوں کو بھی مستقل دھوکے میں رکھا گیا۔

یورپ اور امریکا کی سیاسی قیادت نے یہ راگ الاپنے سے بھی گریز نہیں کیا کہ پہلی جنگِ عظیم کا بنیادی مقصد محض یہ ہے کہ دُنیا سے جنگ کا خاتمہ کردیا جائے یعنی سب مِل جُل کر رہیں اور اپنے معاملات پُرامن طریقے سے چلاتے رہیں۔ جلد ہی پوری دنیا کو اندازہ ہوگیا کہ پہلی جنگِ عظیم دُنیا سے جنگیں ختم کرنے کے لیے نہیں بلکہ مزید جنگیں شروع کرنے کی خاطر شروع کی گئی تھی۔ یہ جنگ محکوم خِطّوں کی بندر بانٹ کے لیے تھی۔ معدنی وسائل سے مالا مال پس ماندہ ممالک کی حیثیت جدید ترین عُلوم وفنون سے آراستہ یورپی طاقتوں کے سامنے ویسی ہی تھی جیسی شیر کے آگے بکری کی ہوا کرتی ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے لیے بھرتی کے وقت بھی امریکی پالیسی سازوں نے چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوجوانوں کو اِس وہم میں رکھا کہ وہ بلند آدرشوں کی تبلیغ کے لیے جارہے ہیں۔ فوج میں نوجوانوں کو بھرتی کرتے وقت یہ بات ذرائع ابلاغ کے ذریعے زور دے کر بیان کی گئی کہ جرمنی انتہائی درجے کی مطلق العنانیت کے شکنجے میں ہے اور جاپان کی حکومت استعماری عزائم ترک کرنے کو تیار نہیں۔ یعنی یہ کہ دونوں کو سزا دینا ضروری ہے لہٰذا فوج میں بھرتی ہوکر اِن دونوں ممالک تک جایئے اور جان قربان کرکے اِن دونوں استعماری قوتوں کے عزائم کی راہ میں دیوار بن جایئے۔ عوام کو اِس بار بھی بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ واشنگٹن کے ایوان ہائے اقتدار میں بیٹھے ہوئے پالیسی ساز ملک کو استعماری قوت بنانے کی راہ پر گامزن ہیں۔ عوام نے مخالفت اور مزاحمت بھی کی مگر اُسے خاطر میں نہیں لایا گیا۔ امریکی قیادت کو جو کچھ کرنا تھا وہی کرتی رہی۔ امریکا میں باضمیر افراد نے طاقت اور خوشحالی کے حصول کی کوشش میں کمزوروں کے زندہ رہنے کے حق کو نظر انداز نہ کرنے کا مطالبہ کیا مگر اُن کی بات اَن سُنی کردی گئی۔

۱۹۴۰ء میں جب جرمن اور جاپانی فوجیں ایشیا اور یورپ میں داخل ہو رہی تھیں تب امریکی حکومت نے اعلیٰ افسران، تاجروں، صنعت کاروں، سرمایہ کاروں، بینکاروں اور دانشوروں کا اجلاس طلب کیا۔ یہ سب لوگ چاہتے تھے کہ خِطّے میں اور خِطّے سے باہر امریکی اثر ورسوخ میں کوئی کمی نہ آئے۔ برطانوی سلطنت کے زیرِ نگیں چند ممالک پر بھی اب امریکی قیادت کی نظر تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ ممالک ہاتھ سے نکل جائیں۔ اجلاس میں طے کیا گیا کہ اب امریکا کو بھی جنگِ عظیم دوم میں حصہ لینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اجلاس میں کہا گیا کہ امریکا کی عسکری اور کاروباری برتری قائم رکھنے کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کرنا چاہیے۔ اجلاس کے شرکا کو اندازہ تھا کہ اگر جنگ کا مقصد صرف امریکی مفادات کو محفوظ رکھنا ہوا تو لوگوں کی دلچسپی کم ہوجائے گی۔ طے کیا گیا کہ امریکی فوج کے لیے بھرتی اور پھر بیرون ملک افواج کی تعیناتی کے حوالے سے دیگر ممالک کے مفادات کی بات بھی کی جائے تاکہ لوگوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا ہو۔ یہ بھی طے ہوا کہ جنگِ عظیم دوم میں حصہ لینے کے حقیقی مقاصد کو چُھپانے کے لیے سرکاری پروپیگنڈا مشینری سے کما حقہٗ استفادہ کیا جائے۔

جنگِ عظیم دوم میں امریکی افواج کیا شریک ہوئیں، تباہی اور بربادی کا دائرہ وسیع کرنے کی راہ ہموار ہوگئی۔ امریکا نے جاپان کے خلاف اپنی طاقت کا بھرپور استعمال کیا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر جوہری بم گِرائے گئے۔ اِن بموں کی زد میں آکر فوری طور پر دو لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ زخمیوں میں سے بھی ہزاروں افراد بعد میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جوہری بموں نے جاپان کے دو شہر، اُس کے مکینوں سمیت، مٹّی میں ملا دیے۔

ہیروشیما اور ناگاساکی پر جوہری بم گِرائے جانے سے بہت پہلے یہ طے تھا کہ جاپانی یہ جنگ ہار چکے ہیں اور اب ہتھیار ڈال دیں گے۔ مگر پھر بھی امریکا نے جوہری بم گرائے! جاپان کے دو شہروں پر جوہری بم گِرانے کا واحد منطقی مقصد یہ تھا کہ امریکا پوری دُنیا کو دکھا دینا چاہتا تھا کہ امریکی فوج کو میسر جوہری بموں کی طاقت کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اب اگر کوئی امریکا سے ٹکرانا چاہتا ہے تو پہلے اُس کی طاقت کا اندازہ لگالے۔

جنگِ عظیم دوم نے امریکا کی سیاسی، معاشی اور عسکری عظمت کو چار چاند لگائے۔ اسٹینڈرڈ آئل کمپنی (موجودہ ایکسان) کے سابق سربراہ لیو وبلچ نے ۱۹۴۶ء میں کہا۔ ''اب ہمیں عالمی منڈی میں سب سے بڑے اسٹیک ہولڈر کا کردار ادا کرنا ہے''۔

جنگِ عظیم دوم کے ختم ہوتے ہی امریکا کا سنہرا دور شروع ہوگیا۔ جنگ میں جرمنی اور جاپان مکمل تباہی سے دوچار ہوئے تھے۔ اُن کی صنعتی صلاحیت خطرناک حد تک کم ہوگئی تھی۔ اٹلی کا حال بھی اچھا نہ تھا۔ اُس کی معیشت بھی بیٹھ چکی تھی۔ دوسری طرف اتحادیوں میں برطانیہ اور فرانس کی معیشت کا حال بہت بُرا تھا۔ امریکا جنگ میں مجموعی طور پر محفوظ رہا تھا۔ اُس کی سرزمین پر کسی نے حملہ نہیں کیا۔ جاپانی بھی پرل ہاربر تک ہی پہنچ سکے تھے۔ یہ صورت حال امریکا کے حق میں جاتی تھی۔ اُس نے صنعتی بنیادوں کو مزید مضبوط کیا اور پھر دنیا بھر میں منڈیاں تلاش کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ امریکا نے عالمی معیشت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق ہانکنا شروع کردیا۔ امریکا چاہتا تھا کہ عالمی معیشت کو بہتر انداز سے چلانے کے لیے نیا نظام لایا جائے جو اُس کے مفادات کو زیادہ تحفظ فراہم کرتا ہو۔ کئی ممالک، جو جنگِ عظیم دوم کے خاتمے پر بہت اچھی حالت میں تھے، یہ سب کچھ قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اُنہوں نے امریکا کی طرف سے عالمی معیشت کو مُٹھی میں لینے سے متعلق کوششوں کے خلاف احتجاج کیا۔

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے اسباب اور مُحرّکات کے بارے میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ محض آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی کوشش کے سِوا کچھ نہیں۔ جرمنی پر نازی ازم یعنی نسل پرستی کو پروان چڑھانے کا الزام عائد کیا گیا۔ اٹلی پر فاشزم کو فروغ دینے کا الزام تھا۔ جاپانیوں کے بارے میں کہا گیا کہ وہ توسیع پسندانہ عزائم رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں عظیم جنگوں کے حقیقی مُحرّکات کچھ اور تھے۔ اِن میں سے یہ مقصد نمایاں تھا کہ امریکا ایک بڑی استعماری قوت بن کر اُبھرے۔

حج وعمرہ سے متعلق اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی کتاب

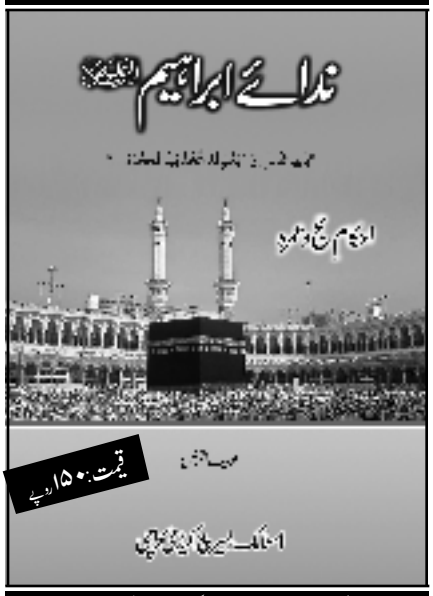

ڈی ۳۵، بلاک ۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی فون: ۳۶۳۴۹۸۴۰

اسرائیل۔فلسطین: نئے معاہدے کی کوششیں

Ibrahim Fraihat

امریکی صدر ٹرمپ کی مشرق وسطی کی سفارتی ٹیم بہت تیزی سے خطے کے دورے کر رہی ہے۔اور یہ ٹیم اپنے ہر دورے کے اختتام پر حتمی نتائج کے اعلان سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔گزشتہ ہفتے امریکی صدر ٹرمپ کے داماد اور اہم مشیر جیرڈ کشنر،جن کو پچھلے سال یہ ذمے داری سونپی گئی تھی کہ وہ مشرق وسطیٰ امن مذاکرات میں تعطل کا خاتمہ کریں،اور مشرق وسطیٰ کے سفیر Jason Greenblatt نے خطے کے اہم ممالک کے ایک اور دورے کا آغاز کیا۔ان ممالک میں اردن،مصر، قطر،اسرائیل اور سعودی عرب شامل ہیں۔

اگرچہ امریکی انتظامیہ اس بات پر زور دے رہی ہے کہ وہ نتائج کے حصول کے قریب پہنچ گئے ہیں،لیکن ان کی ٹیم کے وقتاً فوقتاً مشرق وسطی کے دورے اس بات کا اشارہ دے رہے ہیں کہ وہ منصوبے کے اعلان کے لیے مطلوب تعاون حاصل نہیں کر پا رہے۔جیرڈ کشنر اور گرین بلیٹس کے تازہ ترین دورے کا مقصد بھی امن معاہدے کے لیے سیاسی و مالی تعاون کو یقینی بنانا تھا۔لیکن کسی بھی امن منصوبہ کا اعلان نہ ہونا اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ مذاکرات کامیاب نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے امریکی انتظامیہ ان فریقین پر دباؤ بڑھا رہی جو اس منصوبے کے مخالفت کر رہے ہیں،ان میں خاص طور پر اردن اور فلسطینی اتھارٹی شامل ہیں۔

اردن اور فلسطینی اتھارٹی ان مذاکرات کے آغاز ہی سے اس امن منصوبے کی شدید مخالفت کر رہی ہے اور اس کی معقول وجوہات بھی ہیں۔حتمی منصوبے کے حوالے سے جو معلومات آئی ہیں ان کے مطابق اس "معاہدے" کے تحت یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کیا جائے،اسرائیلی "سیٹلرز" کو مغربی کنارے سے واپس نہیں بھیجا جائے گا اور نہ ہی فلسطینی مہاجرین کو ان کی سرزمین پر واپس بھیجا جائے گا اور اس معاہدے کے تحت اردن کے سرحدی علاقے کا کنٹرول اسرائیل کے پاس ہی رہے گا۔اور فلسطینیوں کو اس کے بدلے غزہ کی تعمیر و ترقی کے لیے مالی امداد دی جائے گی،خاص کر بجلی کی بحالی کے لیے اور انسانی بحران ختم کرنے کے لیے۔

فلسطینی اتھارٹی کے لیے یہ امن منصوبہ قابل قبول نہیں۔ فلسطین کی حالیہ تاریخ میں محمود عباس جتنے مذاکرات کے حامی صدر کوئی نہیں آئے،لیکن بہترین سیاسی اپروچ کے باوجود وہ اس منصوبے کو نہ صرف سختی سے مسترد کر رہے ہیں بلکہ ثالثین کو قبول کرنے سے بھی انکاری ہیں۔

جب ٹرمپ نے امریکی سفارت خانے کو یروشلم منتقل کرنے اور یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرنے کا اعلان کیا تو فلسطینی صدر محمود عباس نے اپنے بیان میں کہا کہ "اب ٹرمپ انتظامیہ کا کردار اس تنازعے میں ثالث کی حیثیت سے بھی قبول نہیں کیا جائے گا"۔اس کے ساتھ ہی فلسطینی اتھارٹی نے وائٹ ہاؤس سے تمام سفارتی تعلقات ختم کرنے اور واشنگٹن سے اپنا سفیر واپس بلانے کا اعلان کر دیا۔

اس سارے کھیل میں فوجی اعتبار سے فلسطینی سب سے کمزور دکھائی دیتے ہیں،لیکن کسی بھی حتمی معاہدے تک پہنچنا ان کی مرضی کے بغیر ممکن بھی نہیں۔اگرچہ ان کے پاس فوجی طاقت نہیں لیکن صرف وہ ہی معاہدے کو قانونی حیثیت دے سکتے ہیں۔ٹرمپ انتظامیہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے، اسی لیے وہ فلسطینی اتھارٹی پر دباؤ ڈال کر اور کبھی کبھی دھمکیاں دے کر اپنی بات منوانے کی کوشش کر رہی ہے۔

PLO کے سیکرٹری جنرل صائب عریقات نے حال ہی امریکی انتظامیہ کی طرف سے پڑنے والے دباؤ کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ کشنر اور گرین بلیٹس فلسطینی قیادت کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔کشنر نے "القدس" اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ "اگر عباس مذاکرات کے عمل میں شامل ہونے کے لیے رضامند نہیں ہوں گے تو ہم ان کے بغیر ہی مذکرات کو آگے لے کر چلیں گے"۔

اسی طرح اردن کے شاہ عبداللہ پر بھی امریکا اور اسرائیل کا دباؤ بڑھ رہا ہے کہ وہ اس معاہدے کو قبول کریں۔کشنر کے دورہ عمان کے دوران اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو نے بھی شاہ عبداللہ سے ملاقات کر کے اس معاہدے پر ان کے تحفظات دور کرنے کی کوشش کی۔خاص طور پر انھوں نے شاہ عبداللہ کو اس بات کا یقین دلایا کہ اس معاہدے کے تحت یروشلم کے مقدس مقامات کا "متولی" اردن کا شاہی خاندان ہی رہے گا۔

اسرائیل اکثر عمان کو اس بات پر دھمکاتا رہا ہے کہ ان مقدس مقامات کی نگہبانی کا منصب اردن کے شاہی خاندان سے لے کر اپنے قریب ہوتے اتحادی "سعودی عرب" کو بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔لیبر پارٹی کی طرف سے اسرائیلی پارلیمان کے رکن Isaac Herzog نے سعودی تعاون سے چلنے والی ایک ویب گاہ Elaph کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ "مذاکرات کے دوران جب یروشلم اور وہاں کے مقدس مقامات جیسا کہ مسجد اقصیٰ کے حوالے سے بات ہو رہی تھی تو میں نے یہ سوچا ان مقدس مقامات کی نگرانی میں سعودی کردار بھی لازمی ہونا چاہیے"۔

مزید یہ کہ اردن میں معاشی حالات کی خرابی پر احتجاج جاری ہے (حال ہی میں IMF کے کہنے پر یہاں اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی نئی ٹیکس اصلاحات متعارف کروائی گئی ہیں)۔امداد پر انحصار کرنے والی معیشت کے حامل ملک اردن کو اس وقت مالی امداد کی اشد ضرورت ہے۔ایسے وقت میں امریکا اور اسرائیل، اردن کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اس موقع کو استعمال کر سکتے ہیں۔

تاہم ابھی تک تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاہ عبداللہ امریکا اور اسرائیل کے دباؤ میں نہیں آئے ہیں۔البتہ شاہ عبداللہ کے دورۂ واشنگٹن کا اعلان کر دیا گیا ہے جہاں وہ ٹرمپ سے ملاقات کے دوران مختلف معاملات پر تبادلہ خیال کریں گے،جن میں اسرائیل،فلسطین امن مذاکرات پر بھی بات چیت ہوگی۔

کیا ٹرمپ کی مذاکراتی ٹیم خلیجی ریاستوں سے مالی امداد کی یقین دہانی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے یا نہیں؟اس بارے میں کوئی سرکاری بیان جاری نہیں کیا گیا۔لیکن حتمی معاہدے کے اعلان کے لیے مالی تعاون کا حصول اتنا اہم نہیں جتنا کہ سیاسی تعاون کا حصول ضروری ہے۔سعودی عرب متعدد بار ٹرمپ انتظامیہ کو اپنی حمایت کی یقین دہانی کروا چکا ہے اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ جب بھی وقت آئے گا تو سعودی عرب امریکی انتظامیہ کی پشت پر ہوگا۔

اور ویسے بھی مالی امداد غزہ میں انفرااسٹرکچر کی تعمیر میں لگائی جائے گی،اس لیے سعودی عرب کے پاس ایک اچھی وجہ ہوگی کہ عوام کو یہ بتائے کہ اس نے فلسطینی مسئلے پر سودے بازی نہیں کی ہے۔ٹرمپ کی سفارتی ٹیم مستقبل قریب میں شاید مالی تعاون کی یقین دہانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے،لیکن اردن اور فلسطینی اتھارٹی سے سیاسی حمایت حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔

موجودہ فلسطینی قیادت کا تختہ الٹنا بھی شائد سودمند ثابت نہ ہو،کیوں کہ ہو سکتا ہے نئی آنے والی قیادت محمود عباس سے زیادہ سخت موقف اپنائے۔اب بھی PLO اور فلسطینی اتھارٹی کے بیشتر ادارے محمود عباس سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ سخت فیصلے کریں،جیسا کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے فیصلے کو معطل کر دیں اور اسرائیل کے ساتھ سکیورٹی کے معاملات میں جاری

باقی صفحہ نمبر ۴

سید مودودیؒ کی فکری کاوشوں کی عصری معنویت

ڈاکٹر محمد رفعت

معروف اسلامی مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ گویا بیسویں صدی کے بڑے حصے پر آپ کی زندگی محیط ہے۔ اس زمانہ کا مطالعہ کریں تو سید مودودیؒ کی فکری کاوشوں کی معنویت سمجھی جاسکتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اللہ کی ہدایت پر مبنی فکر و پیغام کو خود سمجھنا اور دنیا کے سامنے پیش کرنا اہلِ ایمان کی ذمہ داری ہے۔ دینی فکر کسی شخص کی طرف منسوب نہیں، بلکہ اس کا موزوں نام فکر اسلامی ہے۔ یعنی وہ فکر جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے دین پر ہے۔ اس کو سمجھنے اور اس کی تشریح کرنے میں مسلمانوں کے اہلِ علم نے اہم رول ادا کیا ہے۔ وحی الٰہی پر مبنی اس فکر کی مستند تشریح خود نبی کریمؐ نے فرمائی ہے۔ آپ کے بعد امت کی ہر نسل اسلامی فکر کو سمجھنے کی، اسے ترقی دینے کی اور اس کا انطباق کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ امت کے اہلِ علم میں اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں اور انھوں نے بھی اسلامی فکر کے ارتقاء میں حصہ لیا ہے۔

کچھ عرصے سے بعض دوستوں نے 'فکر مودودیؒ' کی اصطلاح کا استعمال شروع کردیا ہے۔ یہ اصطلاح مناسب نہیں۔ جس فکر کو داعیانِ حق کو پیش کرنا ہے، وہ 'فکر مودودی' نہیں بلکہ فکر اسلامی ہے۔ اس کو سمجھنا، فروغ دینا اور دنیا کے سامنے پیش کرنا مقصود ہے۔ ہر صاحبِ علم کی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بڑا کارنامہ یقیناً انجام دیا ہے۔ اس کی قدر کی جانی چاہیے۔ انھوں نے اسلامی فکر کو سمجھنے اور اس کی تشریح کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔

البتہ ہر انسان جو رسول نہ ہو، اس کی فکری اور عملی کوششوں میں غلطیاں ہوسکتی ہیں، اس کا امکان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو وہ طریقہ بتایا ہے، جس سے ہم غلطیوں کے اتباع سے بچ سکتے ہیں اور کمزوریوں پر قابو پاسکتے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کی باتوں کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ نبی کریمؐ نے منشائے الٰہی کی جو تشریح فرمائی، وہ تو خود مستند ہے اور معیار ہے۔ مگر باقی ہر شخص کی باتیں اس لائق ہیں کہ انھیں پرکھا جائے، جانچا جائے اور کتاب وسنت کی کسوٹی پر ان کا جائزہ لیا جائے۔

موجودہ زمانے میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نام اسلام کے ترجمان اور نمائندے کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی خدمات کے جو لوگ قدرداں ہیں ان کے لیے یقیناً یہ خوشی کی بات ہے۔ لیکن بہت سے ناقدین جو مولانا مودودیؒ کا تعارف بحیثیت اسلام کے داعی اور ترجمان کے پیش کرتے ہیں، اس میں تحسین پیشِ نظر نہیں ہوتی، بلکہ تنقید مقصود ہوتی ہے۔ ذرائعِ ابلاغ نے یہ بات مشہور کر رکھی ہے کہ اسلام کے نام پر بعض نامناسب حرکتیں دنیا میں ہورہی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان حرکتوں کی ذمہ داری مولانا مودودیؒ کے لٹریچر اور فکر پر عائد ہوتی ہے۔ اس سیاق میں مولانا مودودیؒ کے ساتھ سید قطبؒ کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ باقی مسلمان مفکرین اور علما کا ذکر اس سلسلے میں کم کیا جاتا ہے۔ یعنی سوال یہ قائم کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی طرف منسوب نامناسب حرکتوں کی ذمہ داری کس فکر پر ہے؟ اس سوال کے جواب میں عام طور پر سید مودودیؒ اور سید قطبؒ کے نام پیش کیے جاتے ہیں کہ ان کے پیش کردہ افکار نے نامناسب اقدامات کی ترغیب دی ہے۔

فکر کا مفہوم

اس منفی پروپیگنڈے کا جائزہ یقیناً لیا جانا چاہیے۔ لیکن یہ اصل موضوع کا ایک ضمنی رخ ہے۔ اصلاً افکارِ مودودی کی تفہیم اور عصر حاضر کے تناظر میں ان کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ مولانا مودودیؒ کے افکار کی معنویت اور فکر اسلامی کے فروغ میں ان کے کردار پر غور کرنے سے پہلے یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے ذہن میں خود فکر کا مفہوم تازہ ہوجائے۔ یعنی فکر سے ہم کیا مراد لیتے ہیں؟

انسان کی فطرت ایسی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کاموں میں مصروف رہتے ہوئے مسلسل عمل کرتا رہتا ہے، البتہ عمل کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن سوچتا بھی رہتا ہے۔ ہاتھ پیر کام میں مصروف ہوتے ہیں اور انسان کا ذہن و دماغ غور وفکر میں مصروف ہوتا ہے۔ دنیا میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کے خیالات میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ کبھی کوئی خیال ان کے دل میں آتا ہے، کبھی اس کے برعکس کوئی دوسرا آجاتا ہے۔ زیادہ تر وہ کسی سوچی سمجھی رائے کے بجائے دنیا کے عام چلن کی پیروی کرتے ہیں۔ دنیا میں جو باتیں ہورہی ہیں وہی ان کے ذہن میں گونجتی رہتی ہیں۔ دنیا میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے وہ متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات کسی ترتیب اور نظم سے خالی ہوتے ہیں۔ ایسے منتشر خیالات کو ہم فکر نہیں کہہ سکتے۔

فکر اس کا نام ہے کہ خیالات اور افکار، ایک ترتیب اور نظم کے ساتھ انسان کے ذہن میں ہوں، وہ ان کو متعین الفاظ میں بیان کرسکے پھر واضح افکار کی بنیاد پر اس کا عملی رویہ تشکیل پائے۔ اس سلسلے میں جو بات ایک فرد کے لیے صحیح ہے، وہی بات گروہ کے لیے بھی درست ہے۔ ایک اجتماعی گروہ، ایک قوم اور ایک جماعت کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ ہر جماعت کے اجتماعی عمل کی بنیاد، اس کے خیالات ہوتے ہیں۔ اگر وہ خیالات منظم ہوں ان کے اندر ترتیب اور ربط ہو تو تصورات کے نظام کو فکر کہا جائے گا۔

وہ لوگ جن کے خیالات میں کوئی ترتیب نہ ہو جن کی سوچ کے پیچھے کوئی شعور نہ ہو ان کے کام دنیا پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالتے۔ وہ محض زندگی گزارتے ہیں اور صفحۂ ہستی سے گزر جاتے ہیں۔ دنیا کے احوال پر جن لوگوں نے کوئی اثر ڈالا ہے وہ وہی تھے جن کے پاس فکر موجود تھی، جن کا شعور تازہ تھا، جن کے ذہن میں یہ بات واضح تھی کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط اور واضح و مربوط فکر کے مطابق وہ عمل کی راہیں تلاش کرتے تھے۔

دینی فکر

فکر کے مفہوم پر غور کے بعد دینی فکر کا مفہوم متعین کرنا چاہیے۔ دنیا میں افکار و خیالات تو بہت سے ہیں۔ ان میں نظریات، فلسفے اور پروگرام شامل ہیں، جو متنوع سماجی اور سیاسی تحریکوں نے پیش کیے ہیں۔ ہر تحریک کے پاس کوئی نہ کوئی فکر ہوتی ہے، جسے وہ پیش کرتی ہے۔ البتہ دینی اور اسلامی فکر کا امتیاز یہ ہے کہ اس کی بنیاد کسی شخص کے خود سوچے ہوئے خیالات و نظریات پر نہیں ہے۔ انسانی استدلال دینی فکر کو سمجھنے میں مددگار تو ہے۔ لیکن فکر کی بنا، کسی انسان کے ایجاد کردہ استدلال پر نہیں رکھی گئی ہے۔

بالفاظِ دیگر دینی فکر کی بنیاد انسانوں کی پیش کی ہوئی کوئی بات اور اس کے حق میں اُن کی فراہم کردہ دلیل نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت دینی فکر کی بنیاد ہے۔ اس کے بالمقابل فلسفیانہ اور نظریاتی فکر کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ نظریاتی اور فلسفیانہ فکر وہ ہے جو کسی انسان نے خود غور وخوض کرکے پیش کی، اس کے حق میں دلائل فراہم کیے اور اپنی فکر کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کچھ شہادتیں پیش کیں۔ دینی فکر کسی

انسان کی تصنیف کردہ نہیں بلکہ اللہ کی ہدایت پر مبنی ہے۔ اس کے بنیادی دلائل وہ ہیں جو اللہ کی نازل کردہ تعلیم کے اندر پیش کیے گئے ہیں۔ اس کی تشریح کی سعی میں علم رکھنے والوں نے حصہ لیا ہے۔ مخلص اصحابِ علم اور ایمان لانے والوں نے اپنی زبان میں اور اپنے حالات کے سیاق میں اس فکر کی تشریح کی ہے۔ لیکن دینی فکر کی بنیاد بہرحال ہدایتِ الٰہی ہے۔

اس مرحلے پر ہمارے سامنے ایک اہم سوال آتا ہے۔ اللہ کی ہدایات کتاب الٰہی کی شکل میں موجود ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے ان کی جو تشریح کی وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ آپؐ کی سیرت، آپ کے اقوال اور صحابہ کا مجموعی اسوہ بھی ہمارے علم میں ہے۔ پھر اس کے بعد کیا ضرورت ہے کہ قرآن، حدیث، سیرت پاک اور سیرتِ صحابہ کے موجود ہونے کے باوجود فکر اسلامی کی از سرِ نو تشریح کی جائے اور اہلِ ایمان کی ہر نسل اس کام پر توجہ دے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس ضرورت کے تین پہلو ہیں۔ ایک ضرورت دعوت کے بنیادی فریضہ سے متعلق ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اسلام کے نظام کی بنیاد ایمان پر ہے۔ اسلام دعوت دیتا ہے کہ آدمی اللہ پر ایمان لائے اور اس کے رسولوں اور حساب کے دن پر ایمان لائے۔ گویا توحید، رسالت و آخرت کو مانے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جہاں ایمان لانے کی دعوت دی ہے وہیں ایمانیات کے حق میں استدلال بھی پیش فرمایا ہے۔

اس موضوع کے اہم سوالات یہ ہیں آدمی توحید پر کیوں ایمان لائے؟ اللہ کو کیوں مانے؟ تنہا اسی کی عبادت کیوں کرے؟ شرک سے کیوں بچے؟ ان سوالات پر کتابِ الٰہی میں مفصل کلام کیا گیا ہے۔ اسی طرح معاملہ رسالت کا ہے۔ کیسے جانچا جائے کہ نبوت کا اعلان کرنے والے شخص کا دعویٰ نبوت صحیح ہے؟ کس بنیاد پر ہم اس کی رسالت پر ایمان لے آئیں؟ اسی طرح یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آخرت کا امکان کیا ہے؟ آخرت کی ضرورت و حکمت کیا ہے؟ یہ سارے موضوعات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں اور مذکورہ بالا سوالات کا تشفی بخش جواب دیا گیا ہے۔

ایمانیات کے دلائل

یہ دینی فکر کا پہلا پہلو ہے جہاں بیان و تشریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یعنی ایمانیات کے لیے جو استدلال قرآن مجید میں پیش ہوا ہے اور جس کی تشریح نبیؐ نے فرمائی ہے، اس کو ہر دور کے اہلِ علم اپنی زبان میں پیش کریں، اور ہر نسل کے سامنے از سرِ نو بیان کریں۔ قرآن و حدیث میں جو دلائل موجود ہیں، اپنے حالات کے سیاق میں ان پر مبنی استدلال کو دوبارہ پیش کریں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایمانیات (رسالت، آخرت اور توحید) کے دلائل محض کارِ دعوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی شخص سے (جو دائرۂ اسلام میں نہیں ہے) گفتگو ہو رہی ہو، تب ضروری ہے کہ توحید و رسالت کے دلائل بیان کیے جائیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ دلائل کے بیان کرنے کے دو مقاصد ہیں: ایک یہ کہ دعوت سننے والا جان لے کہ یہ پیغام صحیح اور برحق ہے۔ لیکن دلائل کا دوسرا مقصد بھی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان لانے والوں کا ایمان تازہ ہو۔ دلائل کی ضرورت محض ان لوگوں کو نہیں ہے جو دین سے ناواقف ہیں بلکہ جو ایمان لا چکے وہ بھی ضرورت مند ہیں کہ توحید، رسالت اور آخرت کے دلائل ان کے سامنے بار بار آئیں، تاکہ ان کا ایمان تازہ ہوتا رہے اور وہ شعور کے ساتھ پیغامِ حق کو انسانیت تک پہنچا سکیں۔

اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے جو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایمانیات کے لیے قرآن مجید نے بصیرت افروز استدلال پیش کیا ہے۔ دلائل کی ندرت کی طرح اس کا طرزِ استدلال بھی منفرد ہے۔ قرآن کے طرزِ استدلال میں گفتگو کا آغاز ان امور و حقائق سے ہوتا ہے جن کو انسان دیکھتا اور جانتا ہے۔ جو کچھ انسان مشاہدہ کرتا ہے اس کا تذکرہ کر کے قرآن انسان کو ان حقائق کی طرف متوجہ کرتا ہے جن کا براہِ راست مشاہدہ انسان نہیں کرتا۔ جو کچھ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں، زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے اور انسان، ان سب میں اللہ کی قدرت اور حکمت کی نشانیاں موجود ہیں۔ نشانیاں تو ہم دیکھتے ہیں مگر جن حقائق کی طرف نشانیاں اشارہ کر رہی ہیں وہ حقائق غیب میں ہیں، وہ ہمیں آنکھوں سے نظر نہیں آتے۔

قرآن کا طرزِ استدلال یہ ہے کہ زمین و آسمان کا جو مشاہدہ تم کرتے ہو وہ تو بدیہی ہے۔ اس کا انکار آدمی نہیں کر سکتا۔ جو کچھ نظر آتا ہے ہم سب اسے مانتے ہیں۔ ان مشاہدات پر توجہ دلا کر قرآن ان حقائق کا تذکرہ کرتا ہے جو چھپے ہوئے ہیں اور غیب میں ہیں۔ اس طرح کلمہ طیبہ کے حق میں قرآن دلیل پیش کرتا ہے۔ اس طرزِ استدلال کا وصف یہ ہے کہ قرآن انسان کی فطرت کو بیدار کرتا ہے۔ انسان کی فطرت حقائق کو جانتی ہے۔ اس لیے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے۔ قرآن فطرت کو جگا کر بتاتا ہے کہ جو بات تم جانتے ہو، اسی کو مان لو۔ تم یہ جانتے ہو کہ تم غیر ذمہ دار نہیں ہو۔ اس لیے مان لو کہ آخرت آئے گی۔ تم یہ جانتے ہو کہ تنہا تمہاری عقل رہنمائی و ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے اس لیے نبیوں پر ایمان لاؤ۔ تم یہ جانتے ہو کہ تمہارا خالق اور مالک ایک ہی ہے تو شکر اسی کا ادا کرو، اس کے ساتھ عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔

اس ربانی طرزِ استدلال کے برعکس دنیا کے جو فلسفے اور نظریے ہیں ان کا طرزِ استدلال دوسری نوعیت کا ہے۔ مثال کے طور پر آج کی دنیا کا مقبول طرز وہ ہے جسے ہم سائنسی طرزِ استدلال کہتے ہیں۔ اس میں اور قرآنی استدلال میں بعض باتیں مشترک ہیں۔ مثلاً مشاہدے کو ذریعہ علم تسلیم کرنا۔ مگر بعض امور مختلف بھی ہیں۔ چنانچہ ہم دینی طرز کو سائنسی طرز استدلال پر قیاس نہیں کر سکتے۔ انسان بہرحال دنیا کے مقبول چلن سے متاثر ہوتا ہے، اس لیے دینی فکر کی تشریح میں اس پہلو کا خیال رکھنا چاہیے کہ ایمان کے دلائل، قرآن کی پیروی کرتے ہوئے بیان کیے جائیں۔ اس اعتبار سے سائنسی طرزِ استدلال مسلمانوں کے لیے علمی چیلنج ہے۔ یعنی اس کی خامیوں کا شعور، مسلمانوں کو حاصل ہونا چاہیے۔

انطباق

قرنِ اول کے بعد مسلمانوں کو یونانی فلسفے کے چیلنج سے سابقہ پیش آیا تھا وہ زیادہ بڑا چیلنج تھا، یونانی فلسفے اور اسلام کے طرزِ استدلال میں جو اختلاف ہے وہ زیادہ نمایاں ہے۔ اس چیلنج کا صحیح جواب وہی تھا جو بالآخر مسلمان اہلِ علم نے دریافت کیا۔ یعنی یونان کے طرزِ استدلال کو یکسر رد کیا جائے۔ صرف استدلال کو نہیں بلکہ استدلال کے طریقے کو بھی رد کیا جائے۔ اس کے بجائے استدلال کے قرآنی طریقے کو سمجھا جائے اور اسی کو پیغامِ حق کی ترسیل میں استعمال کیا جائے۔ یہ دینی فکر کا ایک پہلو ہے۔ یعنی ایمانیات کے دلائل کا بیان۔

دینی فکر کا دوسرا پہلو دین کے پورے نظام اور شریعت کی تعلیمات کے بیان سے متعلق ہے۔ اس بیان کے دوران عملی زندگی سے متعلق ان سوالات کا جواب بھی دینا ہوتا ہے جو دورِ نبویؐ میں انسانوں کے سامنے نہیں آئے تھے۔ اس لحاظ سے یہ موضوع پہلے مبحث سے مختلف ہے۔ ظاہر ہے کہ حالات کے ارتقا کے ساتھ ایمانیات میں تو اضافہ نہیں ہوگا۔ ان کے سلسلے میں جو کچھ بیان کرنا ہے اصولاً وہ موجود ہے۔ صرف مخاطبین کی رعایت سے ان کی زبان میں پیش کرنا ہے۔ لیکن دین کی تعلیمات کا جب حالات پر انطباق کیا جائے گا تو حالات کے فہم کا لحاظ کرنا ہوگا۔ حالات کے اعتبار سے نئے سوالات بھی

انسانوں کے سامنے آئیں گے۔ یہ فکر اسلامی کا دوسرا پہلو ہے۔یعنی دین کی تعلیمات کو بیان کرنا جیسی کچھ وہ ہیں اور جو نئے سوالات پیدا ہوں، ہدایتِ الٰہی کی روشنی میں ان کا جواب تلاش کرنا۔ فکر اسلامی کے اس پہلو میں ارتقا کی ضرورت پیش آتی ہے۔

انسانی علوم

فکر اسلامی کا تیسرا پہلو، دورِ نبویؐ کے بعد انسانی علوم میں ترقی سے متعلق ہے۔ اپنی فطرت کے تقاضے پر لبیک کہتے ہوئے انسان مختلف موضوعات پر غور کرتا اور معلومات حاصل کرتا ہے۔ حالیہ دنوں میں ان علوم نے بڑی ترقی کی ہے۔ موجودہ زمانے میں متنوع علوم موجود ہیں۔ اسلامی دنیا سے باہر پچھلے تین سو برسوں میں انسانی علوم میں قابلِ ذکر اضافے ہوئے ہیں۔ سائنس، سماجی موضوعات، قانون اور نفسیات پر علمی و تحقیقی کام کیا گیا ہے۔ ان سارے علمی شعبوں میں مسلمانوں کا حصہ بہت کم رہا ہے۔ اس لیے عصرِ حاضر کی علمی کاوشوں کے اندازِ تحقیق پر اسلامی فکر نے کم اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ اسلامی فکر کا تیسرا پہلو ان علوم سے متعلق ہے جو انسانوں کی ضرورت ہیں۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے مجبور ہے کہ علم کے میدان میں ترقی کرے، علمی دریافتیں سامنے لائے اور تحقیق و جستجو کرے۔ سوال یہ ہے کہ ان سارے علوم میں اسلام کی عطا کردہ فکری بنیادیں کیا ہیں؟ قرآن، حدیث اور سیرت میں وہ کیا بنیادی تصورات ملتے ہیں جو ان علوم کے فروغ کے لیے اساس فراہم کرتے ہیں؟ سوال پہلے بھی اہم تھا البتہ اپنے دورِ عروج میں مسلمان خود علم کے میدان میں ترقی کر رہے تھے اور تحقیق و جستجو کی رہ نمائی کر رہے تھے تو اس سوال کا جواب واضح تھا۔ زمانہ بھی نسبتاً سادہ تھا۔ مگر اب زمانہ پیچیدہ ہے اور اب مسلمانوں نے علم و تحقیق کے شعبے کو تقریباً چھوڑ رکھا ہے، اس لیے اب ضرورت ہے کہ علوم کی واضح اسلامی اساس فراہم کی جائے۔ یہ فکر اسلامی کے تین موضوعات ہیں جن پر ہر نسل کو کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایمانیات کے دلائل، اسلام کی تعلیم اور اس کا انطباق اور علوم کے لیے اسلامی اساس۔

عصرِ حاضر کی غالب فکر کی تردید

مولانا مودودیؒ کا فکری کارنامہ صرف ان کی تحریروں تک محدود نہیں ہے۔ وہ باعمل شخصیت تھے۔ اس لیے ان کو ''پریکٹیکل آئیڈیلسٹ'' کہا گیا ہے۔ ایسا مثالیت پسند شخص جو عملاً انتہائی سرگرم بھی ہو۔ مولانا مودودیؒ نے افکار پیش کیے اور عملاً تعمیری کام کیا۔ معنویت کے ادراک کے لیے دونوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ جو کچھ لکھا اسے اور جو کچھ کیا اسے بھی۔ اس لحاظ سے جائزہ لیں تو مولانا مودودیؒ کے افکار میں بعض نکات نمایاں ہیں۔ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے موجودہ دور کی غالب فکر کو رد کیا۔ اس فکر کو ہدایت ناشناس کہہ سکتے ہیں۔ یعنی وہ فکر جو ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہے، مولانا مودودیؒ نے اس فکر کے غلبے کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

مولانا مودودیؒ نے محسوس کیا کہ امت مسلمہ ایک یلغار اور طوفان کی زد میں ہے۔ یہ یلغار اور طوفان فکری بھی تھا اور عملی بھی۔ مولانا نے دعوتِ حق کی ابتدا کی تو ہمارا ملک (غیر منقسم ہندوستان) اس وقت غلام تھا اور عالم اسلام کا بڑا حصہ انگلینڈ اور فرانس کا غلام تھا۔ مغرب کی یلغار سیاسی اور فوجی بھی تھی اور علمی و فکری بھی۔ اس کی زد میں امتِ مسلمہ تھی۔ مسلمانوں کا اعتماد اور یقین اسلامی فکر پر متزلزل ہو رہا تھا۔

مولانا مودودیؒ کی تحریروں اور عملی کاوشوں کا مطالعہ کریں تو شروع سے آخر تک یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ نے امت مسلمہ کو دوبارہ دین پر قائم کرنے کی اور انحراف سے اسے بچانے کی کوشش کی۔ تنقیحات اور تفہیمات جیسی مولانا کی تصنیفات اس کی مثالیں ہیں۔ اصلاح امت کو مولانا مودودیؒ کے کام میں کلیدی اہمیت حاصل تھی۔ گویا انھوں نے امتِ مسلمہ کے تحفظ اور دفاع کی فکر کی اور اس کو حملوں سے بچانے کی تدبیریں سوچیں۔

مولانا مودودیؒ نے اس بڑے خطرے کا نوٹس لیا جو باہر سے (یعنی مغربی دنیا سے) نمودار ہوا تھا۔ سیاسی و فوجی یلغار اور اجنبی فکر کے تسلط کی شکل میں یہ خطرہ سامنے آیا تھا۔ اجنبی فکر دین کا، خدا کا اور خدا کی ہدایت کا انکار کرتی تھی۔ تاہم ایسا نہیں تھا کہ امتِ مسلمہ کو صرف بیرونی چیلنج پیش آئے، بلکہ امت کو وہ چیلنج بھی پیش آئے جن کی حیثیت اندرونی خطرات کی تھی۔ مولانا مودودیؒ نے بڑے خطرے کے ساتھ اندرونی خطرات کا بھی نوٹس لیا۔ مثال کے طور پر مسلمانوں میں حدیث کے انکار کا رجحان پیدا ہوا۔ حدیث کے انکار کے رجحان کا کچھ نہ کچھ تعلق (بالواسطہ طور پر) مغربی فکر کے تسلط سے ہے۔ لیکن اس رجحان کا سبب محض مغربی فکر کو نہیں قرار دیا جاسکتا۔ انکارِ حدیث مسلمانوں کی خود اپنی کمزوری ہے۔ جو تاریخ کے مختلف ادوار میں سامنے آتی رہی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے منکرینِ حدیث کی باتوں کا مدلل جواب دیا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں دیگر فتنے اٹھے۔ کسی نادان نے قربانی کا انکار کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قربانی کا حکم اسلام میں نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس کی مدلل تردید کی۔ کسی شخص نے ذبیحہ کے احکام کی غلط تاویل کرنے کی کوشش کی۔ مولانا مودودیؒ نے اس کی اصلاح کی۔ عالم اسلام میں قادیانیت کا بڑا مسئلہ ابھرا۔ پاکستان اور عالمِ اسلام میں بہت سارے لوگوں نے قادیانیت کے فتنے کا مقابلہ کیا۔ مولانا مودودیؒ کا اس سلسلے میں جو نمایاں کردار ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ (پاکستان میں بالآخر قانون کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔ اس کے بعد پورے عالم اسلام میں متفقہ طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم تسلیم کرلیا گیا۔ اس نتیجے کے حصول میں مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کا بڑا رول رہا ہے)۔

مولانا مودودیؒ کے فکری و عملی کام میں واضح مقاصد ان کے سامنے رہے ہیں۔ یعنی امت مسلمہ کا تحفظ اور دفاع۔ فکری یلغار کا مقابلہ اور ان سارے انحرافات اور گم راہیوں کا مقابلہ جو امت میں ابھر رہی تھیں۔ بیرونی اثرات اور اندر کی کم زوریوں کی وجہ سے جو بے راہ روی سامنے آرہی تھی، اس کا مقابلہ سید مودودیؒ نے کیا اور ہر مظہر کا نوٹس لیا جو امت کو غلط راستے پر لے جاسکتا تھا۔

آج اسلامی تحریک کے نام سے متعارف، بہت سے تنظیمیں دنیا کے مختلف حصوں میں کام کر رہی ہیں، ان کے سامنے بڑا وسیع کام ہے جو ان کے منصوبوں کا حصہ ہے۔ منصوبوں میں متعین امور درج ہوتے ہیں۔ مثلاً جماعت اسلامی ہند کے منصوبے میں دعوت، اسلامی معاشرہ کی تعمیر، مسائل کے حل اور خدمت خلق کا ذکر ہے۔ اس طرح کے متعین کام ہر منصوبے کا جز ہوتے ہیں۔ منصوبہ سازی کا تقاضا ہے کہ عمل کی واضح راہیں تجویز کی جائیں۔ تاہم اسلامی مزاج کا تقاضا یہ بھی ہے کہ منصوبہ کے ساتھ ساتھ امت کے مجموعی احوال پر اور اس کی کیفیت پر نظر رکھی جائے اور امت کو انحراف، گمراہی، مغلوبیت اور مرعوبیت سے بچایا جائے۔ کیفیت کے ہر پہلو پر نگاہ ہو، فکری، ذہنی اور عملی۔

مولانا مودودیؒ کی کاوش اس باخبری کی مثال پیش کرتی ہے۔ جو احباب مولانا کے افکار کے قدرداں ہیں ان کو بھی اپنی سعی میں اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ امت مسلمہ کے احوال پر نگاہ رکھنا اور اسے درست خطوط پر قائم رکھنا، مصلحین کی اولین ذمہ داریوں میں سے ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۱۵

اوپیک کسی کے باپ کی جاگیر نہیں!

Jason Bordoff

حال ہی میں آسٹریا کے دارالحکومت ویانا میں ہونے والی متعدد میٹنگز سے تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم ''اوپیک'' نے یہ بات تو ثابت کردی ہے کہ اس کی موت سے متعلق کی جانے والی قیاس آرائیاں انتہائی مبالغہ آمیز ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی ابھر کر سامنے آئی ہے کہ تنظیم ایسی تبدیلیوں سے گزر رہی ہے جن کے نتیجے میں تیل سے تعلق رکھنے والی سیاست و معیشت غیر معمولی حد تک متاثر ہوگی۔

مبصرین ایک زمانے سے اوپیک کا ماتم کر رہے ہیں۔ نومبر ۲۰۱۴ء میں ایک بڑا بحران اس وقت پیدا ہوا جب سعودی عرب نے پیداوار گھٹانے کا اعلان کیا اور عالمی منڈی میں خام تیل کے نرخ بڑھ گئے۔ سعودی عرب کا اقدام امریکا میں شیل آئل کی پیداوار میں اضافے کے تناظر میں تھا۔ امریکا میں شیل آئل کی پیداوار بڑھنے سے عالمی منڈی میں خام تیل کے نرخ بڑھتے ہیں۔ ۲۰۱۵ء میں اس وقت کے امریکی وزیر خزانہ ایلن گرینسپن نے یہ کہہ کر معاملات کو مزید خرابی کی طرف دھکیلا کہ اوپیک اب اپنی طاقت سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ شیل آئل کے حوالے سے جن خدشات کا اظہار کیا جارہا تھا وہ درست ثابت نہ ہوئے اور خام تیل کی بڑھتی ہوئی پیداوار نے ۲۰۱۶ء میں تیل کے نرخ ۲۷ ڈالر فی بیرل کی سطح تک گرادیے۔ اوپیک کے ارکان اور تیل پیداو برآمد کرنے والے دیگر ممالک نے مل کر طے کیا کہ تیل کی پیداوار گھٹائی جائے گی تاکہ نرخ کسی حد تک مستحکم کیے جاسکیں۔

ڈھائی برس کے بعد اوپیک کی پیداوار میں کمی لائے جانے کے نتیجے میں تیل کے نرخ بلند ہوئے ہیں۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی طرف سے ایران پر نئی پابندیاں عائد کیے جانے کے اعلان کے بعد تیل کے نرخ ۸۰ ڈالر فی بیرل تک جاپہنچے ہیں۔ یہ صورتحال امریکا اور یورپ کے لیے خطرناک ہو یا نہ ہو، چین اور بھارت جیسے تیل کے بڑے صارفین کے لیے انتہائی پریشان کن ہے۔ دونوں ممالک نے اوپیک پر زور دیا ہے کہ وہ تیل کی پیداوار بڑھائیں تاکہ نرخ نیچے لائے جاسکیں۔ نرخوں میں اضافے سے چین اور بھارت دونوں ہی کی معیشت شدید متاثر ہوئی ہے۔ چین، برازیل، اردن اور کئی دوسرے ممالک میں پٹرولیم مصنوعات کے بڑھتے ہوئے نرخ عوام کو احتجاج پر مجبور کررہے ہیں۔ کئی ممالک کی معیشت شدید بحرانی کیفیت سے دوچار ہے۔ امریکا اور یورپ متبادل ذرائع کی طرف لپک رہے ہیں۔ بجلی سے چلنے والی گاڑیوں کو مقبولیت سے ہم کنار کرنے کی کوششیں تیز کردی گئی ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اوپیک کے ارکان جس بحران سے دوچار ہیں وہ خود انہی کا پیدا کردہ ہے۔ عالمی منڈی میں تیل کے نرخ غیر معمولی حد تک انہوں نے خود بلند کیے تھے اور یہ مدت جب طول پکڑ گئی تو امریکا میں شیل آئل کی مقبولیت کا آغاز ہوا۔ اس کے نتیجے میں عمومی خام تیل کے نرخ گرے۔ اگر عالمی منڈی میں عمومی خام تیل انتہائی مہنگا نہ ہوا ہوتا تو تیل کے حصول کے دیگر ذرائع کی تلاش میں لوگ نہ نکلے ہوتے۔

اس وقت عالمی منڈی میں تیل کے بلند ہوتے ہوئے نرخ بھی دراصل اوپیک کی غلط حکمت عملی کا نتیجہ ہیں۔ چند ارکان نے پیداوار میں غیر معمولی کمی کی اور وینزویلا نے پیداوار میں اچھی خاصی کٹوتی کردی۔ خام تیل کے نرخ ایک بار پھر بلند ہوتے جارہے ہیں اور اس کے نتیجے میں محض خرابیاں جنم لے رہی ہیں۔ اوپیک کے ارکان جو کچھ چاہتے ہیں اس سے زیادہ کرگزرتے ہیں جو تیل کے نرخوں کو فوری طور پر تو بلندی عطا کرتا ہے مگر آگے چل کر اس کے شدید منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

عالمی منڈی میں تیل کا بحران ختم کرنے کے لیے لازم ہے کہ اوپیک کے ارکان ۲۰۱۶ء کے عہد کے مطابق پیداوار میں اضافہ کریں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ پیداوار گھٹانا تو کوئی بات ہی نہیں، ہاں بڑھانا بہت بڑا دردِ سر ہے۔ اس وقت صرف سعودی عرب، روس، کویت اور متحدہ عرب امارات میں پیداوار فوری طور پر بڑھانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ان چاروں ممالک کے سوا اوپیک میں یا اس سے باہر کوئی بھی ملک پیداوار کو فوری طور پر بڑھانے کی پوزیشن میں نہیں۔ پیداوار کو جس حد تک گھٹانا تھا اسے اگر اوپیک کے ارکان نے آپس میں بانٹ لیا ہوتا تو آج یہ بحرانی کیفیت پیدا نہ ہوئی ہوتی۔ اس وقت پیداوار میں فوری طور پر ۶ لاکھ بیرل یومیہ اضافے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہونے سے عالمی منڈی میں تیل کے نرخ بڑھتے ہی رہیں گے اور یوں معاملات بحرانی کیفیت سے دوچار رہیں گے۔

اوپیک اندرونی بحران کا بھی شکار ہے۔ اس کے ارکان اب تک واضح نہیں کرپائے ہیں کہ وہ مل کر کیا کرنا چاہتے ہیں اور الگ الگ، انفرادی حیثیت میں کیا سوچ رکھتے ہیں۔ میڈیا میں اوپیک کے ارکان یہ بات کھل کر بیان کرنے کی پوزیشن میں نہیں کہ ان میں کون کیا چاہتا ہے، ترجیحات کیا ہیں۔ پیداوار گھٹانے یا بڑھانے پر کامل اتفاق نہیں پایا جاتا۔ سارا زور یہ ثابت کرنے پر ہے کہ اوپیک اب بھی تیل کی عالمی منڈی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مبصرین اس بات کو سمجھتے ہیں کہ محض دعوے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اوپیک کو یہ بات کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا ہوگا کہ وہ اب بھی مستحکم ہے اور تیل کی عالمی منڈی پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔

اوپیک میں سعودی عرب کا کردار ہمیشہ کی طرح غیر معمولی حد تک بڑا ہے۔ وہ اب بھی تمام بڑے فیصلوں پر اپنے غالب اثرات رکھتا ہے۔ سعودی عرب ہی نے حال ہی میں کیے جانے والے فیصلے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے کہ نرخ کو ایک حد سے زیادہ بلند ہونے سے روکا جائے۔ سعودی عرب پیداوار گھٹانے اور بڑھانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف ایران چاہتا ہے کہ پیداوار میں اضافہ کیا جائے تاکہ تیل کی عالمی منڈی میں استعمال پیدا ہو اور امریکا ایرانی قیادت کے خلاف اقدامات سے باز رہے۔ ایران اب بھی یہ بتانے کی پوزیشن میں نہیں کہ وہ تیل کی رسد میں اضافے کے حوالے سے کیا کرسکتا ہے جبکہ سعودی عرب کا کہنا ہے کہ رسد میں دس لاکھ بیرل یومیہ کا اضافہ ممکن ہے۔ سعودی عرب کا یہ بیان تیل کے نرخ مستحکم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ سعودی عرب اور روس دونوں ہی اس بات کے حق میں ہیں کہ عالمی منڈی میں نرخ قابو میں رکھنے کے لیے پیداوار میں متعد بہ اضافہ کیا جائے۔

روس اگرچہ اوپیک کا باضابطہ رکن نہیں ہے مگر وہ تیل پیدا کرنے والا تیسرا سب سے بڑا ملک ہوگیا ہے۔ سعودی عرب اور روس بہت سے معاملات میں اتفاق رائے کی منزل تک پہنچ گئے ہیں۔ اوپیک کے فیصلوں میں روس کا عمل دخل بڑھتا جارہا ہے۔ سعودی عرب اور روس مل کر اس تنظیم کو چلا رہے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں اوپیک ممالک تیل کی عالمی پیداوار کا نصف فراہم کررہے تھے۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں معاملہ ایک تہائی رہ گیا۔ اب یہ تنظیم تیل کی عالمی پیداوار کا ۴۰

فیصد فراہم کر رہی ہے۔ تیل کی عالمی پیداوار کو معقول حد تک رکھنا انتہائی دشوار عمل ہے۔ سعودی عرب جو کچھ چاہتا ہے اس سے روس مکمل طور پر متفق نہیں ہوسکتا۔

تیل کی عالمی منڈی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت سے روس کے سربراہ ولادی میر پوٹن کی پوزیشن مزید بہتر ہوئی ہے اور وہ عالمی سطح پر اپنے آپ کو زیادہ منوانے کی پوزیشن میں آگئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں آگے چل کر ماسکو بہت سے معاملات میں واشنگٹن سے زیادہ ڈٹ کر بات کرنے کی پوزیشن میں آجائے گا۔ امریکا یہ تاثر ضرور دے رہا ہے کہ وہ توانائی کے معاملے میں دوسروں کا زیادہ محتاج نہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تیل کی عالمی منڈی متاثر ہوگی تو امریکا بھی لامحالہ متاثر ہوگا۔

امریکا کی خام تیل کی یومیہ پیداوار بیس لاکھ بیرل تک ہے مگر صرف بھی بہت زیادہ ہے۔ شیل آئل کی پیداوار میں کمی بیشی واقع ہوتی رہتی ہے۔ امریکا میں بیسیوں ادارے اس شعبے سے وابستہ ہیں۔ کوئی بھی ایسا ویسا فیصلہ معاملات کو بہت بگاڑ دے گا۔ امریکی قیادت خواہ کچھ کہے، کوئی بھی دعوی کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ آج بھی عالمی سیاست تیل اور گیس کے گرد گھومتی ہے۔ امریکا بھی، سپر پاور ہونے کے باوجود، تیل کی بنیاد پر کی جانے والی سیاست کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ اپنے دورۂ سعودی عرب میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے سعودی قیادت سے استدعا کی تھی کہ تیل کی پیداوار بڑھائی جائے تاکہ ایران کی جانب سے تیل کی پیداوار گھٹانے کے اعلان سے امریکی صارفین متاثر نہ ہوں!

ویانا کے حالیہ اجلاسوں سے یہ ثابت ہوگیا کہ اوپیک ابھی مری نہیں مگر خیر، اس کے اثرات غیر معمولی بھی نہیں۔ تیل پیدا اور برآمد کرنے والے ممالک کو بہت سے معاملات میں اب بھی توازن قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ معاملات کو بگڑنے سے بچایا جاسکے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"This isn't your father's OPEC anymore".
("Foreign Policy". June 26, 2018)

قطر بحران، ایک سال بعد

Sultan Barakat

گزشتہ سال ۵ جون کو جب سعودی عرب، بحرین، متحدہ عرب امارات اور مصر کی جانب سے قطر پر پابندیاں عائد ہوئیں تو بہت کم لوگوں کا خیال تھا کہ یہ زیادہ عرصے برقرار رہیں گی۔ ایک سال بعد قطر کی خارجہ پالیسی سے مایوس ہوکر اسے بدلنے کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات نے سیاسی اختلافات کو مزید گہرا کردیا ہے بلکہ اب خلیجی ممالک کا اتحاد بھی خطرے میں نظر آتا ہے۔

آج کوئی بھی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ ان پابندیوں کے منفی اثرات تمام متعلقہ ممالک پر مرتب ہوئے ہیں جن میں سعودی عرب بھی شامل ہے۔ سعودی عرب نے اس اقدام کے ذریعے خلیجی ممالک کے دفاع کو داؤ پر لگا دیا ہے جنہیں وہ ایران کے توسیع پسندانہ عزائم سے بچانا چاہتا تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ ابتدا میں قطر کو امید تھی کہ یہ پابندیاں کم وقت کے لیے ہوں گی اور اُس وقت قطر تعلقات کی بحالی کے لیے بے تاب تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ قطر ایسا ہر قیمت پر چاہتا تھا۔ جوں جوں ہفتے اور مہینے گزرتے گئے قطر نے اس کوشش پر زور دیا کہ وہ اس بحران میں سے بھی کوئی مثبت پہلو ڈھونڈ نکالے۔ تاکہ وہ اپنے پڑوسی ممالک کی جانب سے تنہا کردیے جانے کے جھٹکے سے نبٹ سکے۔

قطر نے ملک میں بحرانی کیفیت کو معاشرتی ہم آہنگی اور معاشی پائیداری میں بدلنے کی صلاحیت کا متاثر کن مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں وہ مالی پالیسیاں بھی شامل ہیں جنہیں اپنانے سے پابندیوں کے دوران بھی قطری ریال مستحکم رہا۔

البتہ، ان مشکل حالات میں ایک مثبت چیز یہ تھی کہ اس بحران نے نادانستہ طور پر قطر کو مشرق وسطیٰ کے ممالک کی تباہ کن پالیسیوں سے دور رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے قطر کو خطے میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں مدد ملی ہے۔

قطر یمن کی جنگ سے علیحدہ ہونے پر مطمئن ہے:

پابندیوں کے ابتدا میں ہی قطر کو اس اتحاد سے بے دخل کردیا گیا تھا جو یمن میں حوثی باغیوں کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ قطر نے اس اتحاد میں ہچکچاتے ہوئے حصہ لیا تھا جس کی وجہ صرف سعودیوں کو خوش کرنا تھا۔

یمن کی جنگ میں مزید ایک سال گزرنے کے بعد بھی مصائب واموات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ سعودی پابندیوں نے بھی ملک کی ۲۸ ملین آبادی کو تباہی کی طرف دھکیل دیا۔ ان اقدامات کی وجہ سے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کی ساکھ پر منفی اثرات مرتب ہوئے، لیکن خوش قسمتی سے قطر ان منفی اثرات سے محفوظ رہا۔ یہ عالمی ذرائع ابلاغ اور سول سوسائٹی کی نظر میں قطر کی پہلی جیت تھی۔

مزید یہ کہ یمن کے مستقبل کے حوالے سے اختلافِ رائے کے باعث سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے اتحاد میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔ اس صورتحال میں قطر ایک قابل اعتماد فریق بن کر سامنے آیا ہے کیوں کہ اس کے یمن کی علاقائی سالمیت کے حوالے سے کوئی عزائم نہیں ہیں۔

دوسری بات یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عرب بہار نے جو صورت اپنائی اس نے قطر کی خارجہ پالیسی کی ساکھ کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ عالمی سطح پر بڑے پیمانے پر یہ تاثر موجود تھا کہ قطر کی ساکھ متاثر کرنے میں سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کا ہاتھ ہے اور موجودہ پابندیوں نے اس تاثر کو مزید پختہ کردیا ہے۔

ٹرمپ انتظامیہ کا ساتھ دینے اور امریکی سفارت خانے کی یروشلم منتقلی کے معاملے پر امریکا کی خاموش حمایت کرنے کی وجہ سے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات عرب دنیا میں اپنی مقبولیت کھو چکے ہیں۔

پابندیوں کے دوران قطر نے کسی بھی قسم کی جوابی کاروائی سے گریز کیا اور عالمی قوانین کی پیروی کرتے ہوئے محتاط سفارت کاری کا راستہ اپنایا۔ اس طرح قطر نے نہ صرف رائے عامہ کو اپنے حق میں کرلیا بلکہ پابندیوں کے دوران اخلاقی برتری بھی حاصل کیے رکھی۔

پابندیوں کے خاتمے کے لیے اپنی خودمختاری کو قربان نہ کرنے کے فیصلے کی وجہ سے قطر کے پاس یہ اختیار موجود رہا کہ وہ ایران کے جوہری معاہدے کے حوالے سے اپنا آزاد موقف رکھے اور مجبوراً امریکا کی حمایت نہ کرے۔

اس فیصلے نے قطر کو اپنے ہم خیال عرب، یورپی اور ایشیائی ممالک (اور سمجھ بوجھ رکھنے والے امریکی سیاست دانوں) کے ساتھ لا کھڑا کیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سالوں کی محنت اور بات چیت کو اس طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کا اتحاد خطرے میں ہے:

ماضی کے ان مثبت اور حوصلہ افزا حالات کے باوجود قطر کے لیے آگے کا راستہ دشوار ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ موجودہ پابندیوں کے بعد قطر نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے، کیا قطر آگے کا راستہ بھی اکیلے ہی طے کرنا چاہتا ہے؟

قطر خطے میں اپنے سیاسی، معاشی اور معاشرتی اثر ورسوخ کو پھیلانا چاہتا ہے، لیکن موجودہ پابندیاں اس کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ قطر اپنی طویل مدتی حکمت عملی پر نظر ثانی کرے۔

قطر کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ موجودہ انداز کو برقرار رکھتے ہوئے ٹکراؤ کی پالیسی سے گریز کرے اور یہ امید رکھے کہ قطر مخالف اتحاد (جس میں پہلے ہی دراڑیں موجود ہیں) اندرونی انتشار کی وجہ سے ٹوٹ جائے گا۔

ابوظہبی، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب میں بڑھتی ہوئی دوریاں، صدر ٹرمپ کی انتخابی مہم پر ہونے والی تحقیقات اور اسرائیلی وزیر اعظم پر بدعنوانی کے الزامات پر تحقیقات کی وجہ سے امریکا، سعودی عرب، متحدہ عرب مارات اور اسرائیل کا اتحاد بھی اپنی طاقت کھوتا جا رہا ہے۔

سعودی شہزادے محمد بن سلمان اپنے ملک میں تبدیلی لانے کے لیے پرعزم ہیں۔لیکن ان تبدیلیوں کی وجہ سے وہاں وہابی ازم اور آلِ سعود کو خطرات لاحق ہیں۔محمد بن سلمان کے فلسطین کے حوالے سے متنازع بیانات کی وجہ سے سعودی عرب بھی عربوں کی نظر میں اپنی قدر کھو چکا ہے۔

اگر محمد بن سلمان اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے تو انھیں قطر کا شکر گزار ہونا ہوگا۔ کیوں کہ قطر نے ہی محدود آزادی اور وہابی ازم کی نسبتاً آزاد معاشرہ متعارف کروا کے اس تبدیلی کا راستہ دکھایا تھا۔

قطر کے لیے ایک اچھا موقع ہے کہ وہ ایران کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر کر لے۔ پابندیاں جتنی طویل ہوں گی قطر اور ایران کے قریب آنے کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔کویت اور عمان بھی ایران کے حوالے سے عقلی موقف رکھتے ہیں۔ یہ دونوں ملک قطر کے احسان مند ہیں کہ وہ سعودی جارحیت کے سامنے ڈٹا ہوا ہے۔کیوں کہ اگر قطر پابندیوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا تو پھر یہ دو ممالک بھی اس ہی طرح کی پابندیوں کا شکار ہوتے۔

قطر کے ایران کے ساتھ مستقل اور ناگزیر تعاون کے لیے ضروری ہے کہ ایران بھی اپنی پالیسیوں میں معتدل رہے۔لیکن ایران کے ساتھ جوہری سمجھوتے سے پیچھے ہٹنے کے امریکی فیصلے کی وجہ سے ایران کے سخت گیر افراد مزید طاقتور ہو جائیں گے۔صدر ٹرمپ اپنی تنگ نظری کے باعث ایران کے موجودہ صدر حسن روہانی اور ان کے پیش رو احمدی نژاد میں فرق نہ کر سکے۔قطر کے لیے کامیابی کا راستہ یہی ہے کہ وہ یورپی یونین کے ساتھ مل کر ایران جوہری سمجھوتے کو بچانے کی کوشش کرے اور اس دوران ایران کی اعتدال پسند حکومت کے لیے حمایت حاصل کرے۔اس کے علاوہ قطر ایران کو یہ سمجھانے میں بھی مدد کر سکتا ہے کہ عرب ممالک میں ایران کے توسیع پسند عزائم ایران کے مفاد میں نہیں ہیں۔

صورت حال بہت بہتر رہے گی اگر ایران اپنی توجہ ملک میں گیس کی تلاش، صنعتی فروغ اور ترقی پر مرکوز رکھے۔

گیس کارٹیل کے لیے امکان موجود ہے!

قطر کو خلیج تعاون تنظیم کی ناکامی سے پریشان ہونے کے بجائے دیگر ممالک کے ساتھ نئے دفاعی اور معاشی معاہدوں کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

قطر اپنی کل گیس برآمدات کا ۴۰ فی صد جنوبی کوریا اور جاپان کو برآمد کرتا ہے۔ ان ممالک کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کی تجدید کی تاریخ قریب آتی جا رہی ہے۔اس وجہ سے قطر کی پہلی ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ وہ گیس کی عالمی منڈی میں اپنی الگ حیثیت منوائے تاکہ اسے امریکا اور آسٹریلیا جیسے حریف ممالک کے مقابلے میں فائدہ حاصل ہو۔

اس کے لیے قطر کو چاہیے کہ وہ روس، الجیریا اور ایران کے ساتھ مل کر ایک گیس کارٹیل بنانے پر دوبارہ غور کرے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ معاشی اتحاد آگے چل کر دفاعی اتحاد بھی بن جائے۔لیکن قطر کو ترکی جیسے ممالک کے لیے بھی اپنے دروازے کھلے رکھنے ہوں گے جنھوں نے پابندیوں کے دوران قطر کی حمایت کی۔

یہ اقدامات صرف پابندیوں کا سامنا کرنے کے لیے نہیں ہونے چاہییں۔ قطر کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کس طرح عالمی برادری کو اپنی معیشت کے حوالے سے مطمئن کر سکتا ہے۔ کیوں کہ یہی اس بات کی ضمانت ہوگی کہ قطر اب بھی مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے۔ (ترجمہ: محمد عمید فاروقی)

"The Gulf crisis one year on: What next for Qatar?". ("aljazeera.com". June 5, 2018)

انسانیتِ عامہ

مولانا مودودیؒ کے افکار میں ایک دوسرا وصف بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے بجا طور پر اس امر کا ادراک کیا کہ امتِ مسلمہ کے علاوہ آج کے دور کا عام انسان بھی ایک بڑی گمراہی کی زد میں ہے۔ وہ گمراہی ایسی ہے جس نے انسان کی ساری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو متاثر کیا ہے۔مختصر لفظوں میں اس کو ہدایتِ الٰہی سے بے نیازی کہہ سکتے ہیں۔ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو صریح الفاظ میں خدا کا انکار کرتے ہیں لیکن جو خدا کا انکار نہیں کرتے وہ بھی خدا کی ہدایت کا انکار کرتے ہیں یا کم از کم اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔خدا کی ہدایت سے وہ بے نیاز ہیں۔ یہ عصر حاضر کی اصل گمراہی ہے۔

امتِ مسلمہ سے آگے بڑھ کر دنیائے انسانیت پر مولانا مودودیؒ نے ایک حساس انسان کی حیثیت سے نظر ڈالی۔انھوں نے محسوس کیا کہ ہدایت ربانی کی ناقدری موجودہ دور کی بنیادی گمراہی ہے۔ یہ ہدایتِ الٰہی سے بے نیازی کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ انھوں نے اس گمراہی کے مقابلے کے لیے اپنے مدلل افکار پیش کیے۔گمراہ کن افکار کے مقابلے میں انھوں نے اسلام کو پیش کیا۔ انھوں نے استدلال کا آغاز ان امور سے کیا جن کو موجودہ دور کا آدمی تسلیم کرتا ہے۔مقبول رجحانات کا نوٹس لیا، ان کے دلائل سے تعرض کیا، متعین فلسفوں اور خیالات پر تنقید کی۔ ان کی کمزوریاں واضح کیں اور ہدایتِ الٰہی کی اتباع کی ضرورت کو واضح کیا۔

افکارِ مودودیؒ کا جامع بیان

مولانا مودودیؒ نے ایک گفتگو میں کہا تھا کہ جب میں نے اپنا علمی کام شروع کیا تو سوچا تھا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھوں گا، پھر احادیث کا مجموعہ ترتیب دوں گا۔ پھر سیرت پر کتاب لکھوں گا۔لیکن تفسیر لکھنے میں ہی ایک لمبا وقت لگ گیا، تو اب باقی دو کاموں کا موقع نہیں ہے۔قرآن مجید کی تفسیر کو ۱۹۴۲ء میں لکھنا شروع کیا تھا وہ ۱۹۷۲ء میں جا کر مکمل ہوئی۔ گویا تیس سال کے عرصے میں۔ (بہر حال مولانا مودودیؒ کے احباب نے آپ ہی کی تحریروں سے انتخاب کر کے سیرت کی کتاب بھی مرتب کی اور احادیث کا مجموعہ بھی مرتب کر لیا)۔

مولانا مودودیؒ کے افکار کو واضح اور مفصل شکل میں تفہیم القرآن میں پیش کیا گیا ہے، دوسری کتابوں میں یہ جامعیت نہیں ہے، وہ تو کسی متعین موضوع پر ہیں، لیکن تفہیم القرآن کی چھ جلدیں ایسی ہیں جو مولانا کے افکار کو بہت واضح اور آسان اسلوب میں پیش کرتی ہیں۔ آج بہت سے احباب ایسے ہیں جنھوں نے مولانا مودودیؒ کی کچھ کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے افکار کے بارے میں ایک رائے قائم کی ہے۔ایسی رائے کچھ زیادہ صحیح نہیں ہوتی۔اگر تفہیم القرآن کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا کا پورا پیغام کیا ہے۔اپنی مختصر کتابوں میں وہ ہر پہلو کو بیان کرنے کا موقع شاید نہیں پا سکے۔ظاہر ہے کہ انسان، انسانی زبان ہی میں کلام کرتا ہے۔ انسانی کلام میں محدودیت ہوتی ہے۔ یہ تو صرف خدا کی زبان ہے جو مکمل ہوتی ہے۔کلامِ الٰہی کی ایک آیت بھی پڑھیں تو ہدایت ملتی ہے۔ لیکن انسانی کلام جامع نہیں ہوتا۔بہر حال افکارِ مودودیؒ تفہیم القرآن میں نسبتاً زیادہ جامع شکل میں سامنے آتے ہیں۔۔۔جاری ہے!

(بشکریہ: ماہنامہ ''زندگی نو'' نئی دہلی۔مئی ۲۰۱۸ء)

ڈرون ٹیکنالوجی: فضاؤں میں ایک نیا اضافہ

Alex Fitzpatrick

گزشتہ برس ستمبر میں جب ''ماریا'' نامی طوفان پورٹو ریکو سے ٹکرایا تو وہاں انفراسٹرکچر کی تباہی کے ساتھ ساتھ مواصلاتی نظام کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ جس کی وجہ سے وہاں کی آبادی کا دیگر علاقوں سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس مشکل وقت میں موبائل سگنلز کی فراہمی کے لیے AT&T نامی کمپنی نے ایک تجربہ کیا۔ اس کمپنی نے ''Flying Cow'' کے نام سے ایک ڈرون متعارف کروایا جو اپنے اطراف میں ۴۰ میل تک سگنلز کی فراہمی ممکن بنا سکتا تھا۔ اسے جیسے ہی آن کیا جاتا تو لوگ اس علاقے میں آسانی سے موبائل استعمال کر سکتے تھے۔

دنیا بھر میں متعارف کروائی جانے والی بیشتر ٹیکنالوجیز آغاز میں محدود استعمال کی حامل ہوتی ہیں لیکن پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ڈرون بھی اسی طرح چند سال پہلے تک صرف دفاعی کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا یا پھر کچھ لوگ شوقیہ طور پر ڈرون رکھا کرتے تھے۔

۲۰۰۱ء میں امریکی فوج نے پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقوں میں ڈرون کا استعمال کیا تو یہ دنیا بھر میں امریکی فوج کی طرف سے ڈرون ٹیکنالوجی کا پہلا استعمال تھا اور پھر اوباما اور ٹرمپ کے دور میں بھی اس کا استعمال جاری رہا۔

البتہ ڈرون کا سویلین استعمال اب بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ صرف ۲۰۱۷ء میں دنیا بھر میں تقریباً ۳۰ لاکھ ڈرون فروخت ہوئے۔ دس لاکھ ڈرون امریکی انتظامیہ برائے ہوابازی کے ہاں رجسٹر ہوئے (امریکا میں کسی بھی اسٹور پر فروخت کیے جانے والے ڈرون کے لیے امریکی انتظامیہ برائے ہوابازی کے پاس رجسٹرڈ ہونا لازمی ہے)۔

یہ ڈرون ہالی ووڈ کی فلموں سے لے کر زراعت تک، ماحولیاتی آلودگی کو کنٹرول کرنے سے لے کر کوہ پیماؤں کی مدد کرنے تک بے شمار کاموں کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ یہ ڈرون میلوں کا سفر طے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ڈرون ٹیکنالوجی کے کمرشل استعمال کی جو پہلی لہر تھی وہ اس حد تک تھی کہ کسان اپنی زمینوں کی دیکھ بھال اور پراپرٹی ڈیلر متعلقہ زمین کی تصاویر بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لیکن آنے والے دنوں میں اس صنعت میں ایک انقلاب برپا ہونے والا ہے۔ Amazon نامی کمپنی ایک ایسا ڈرون تیار کر رہی ہے جو ہر قسم کے پارسل کو چند منٹوں میں مقررہ جگہ پر پہنچا دے گا اور پھر یہی ٹیکنالوجی کسی بھی طبی ایمرجنسی کی صورت میں حساس اعضا کی منتقلی کے لیے بھی استعمال ہوگی۔ ''فیس بک'' ایسا ڈرون تیار کرنے کے مراحل میں ہے جس سے دنیا کے کونے کونے میں انٹرنیٹ کی سہولت مہیا کی جا سکے گی۔ Shell نامی کمپنی تیل نکالنے کے لیے سمندر میں موجود اپنے پلانٹس کی نگرانی کے لیے ڈرون استعمال کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسی طرح سرمایہ کار اس شعبہ میں نئے آنے والی کمپنیوں پر کروڑوں ڈالر کی سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ ڈرون کی صنعت پر فی الوقت چین کا غلبہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر میں ڈرون کے کاروبار کا ۷۲ فیصد حصے کا کنٹرول DJI نامی کمپنی کے پاس ہے، جس کا مرکزی دفتر Shenzhen چین میں واقع ہے، اسے چین کی Silicon Valley بھی کہا جاتا ہے۔

اس ساری سرمایہ کاری نے جہاں بہت سے مواقع پیدا کیے ہیں وہیں بہت سے خدشات بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ ٹیکنالوجی نجی زندگی پر اثر انداز ہوگی۔ اسی طرح ڈرون جیلوں میں منشیات کی اسمگلنگ کے لیے بھی استعمال کیے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ امریکی فوج لاکھوں ڈالر سالانہ اس پر خرچ کر رہی ہے کہ اس ٹیکنالوجی کو دہشت گردوں کے ہاتھ لگنے سے بچایا جائے۔ اس طرح کے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ لوگوں نے اپنے مکانات پر اڑنے والے ڈرون کو اپنی ''پرائیویسی'' میں مداخلت سمجھ کر خود ہی نشانہ بھی بنایا ہے۔

ڈرون کے استعمال میں اس وقت اچانک اضافہ ہوا جب ۲۰۱۶ء میں امریکی انتظامیہ برائے ہوابازی نے کمرشل استعمال کے لیے ڈرون ''آپریٹ'' کرنے کے پروفیشنل سرٹیفکیٹ جاری کرنا شروع کیے۔ اب امریکا میں تقریباً ایک لاکھ ۲۲ ہزار لوگوں کے پاس ڈرون چلانے کے سرٹیفکیٹ ہیں۔ چھوٹے ڈرون سافٹ ڈرنک کی ایک کین کے سائز کے ہوتے ہیں جو ایک کیمرے کا وزن اٹھا کر آسانی سے فضا میں پرواز کر سکتے ہیں۔

ڈرون کے استعمال میں اضافہ حکومتی اداروں کے لیے ایک چیلنج بنتا جا رہا ہے۔ امریکی انتظامیہ برائے ہوابازی نے ڈرون کے بڑھتے ہوئے استعمال کو دیکھتے ہوئے چند قواعد و ضوابط کا نفاذ کیا ہے۔ جس میں یہ قانون بھی شامل ہے کہ کوئی ڈرون اڑانے والا شخص ڈرون کو اس حد تک دور نہیں لے جا سکتا کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اس شعبے میں سرمایہ کاری کرنے والوں کی طرف سے اس قانون پر شدید تنقید کی جا رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح کے اقدامات سے ترقی کرتی ہوئی اس صنعت کو نقصان پہنچے گا۔ Amazon اپنے کسٹمر کو کسی طرح کوئی پارسل پہنچائے گی جب ڈرون کو پائلٹ کی نظروں سے اوجھل ہونے کی اجازت ہی نہیں ہوگی۔ نقل و حمل کا محکمہ ڈرون بنانے والی کمپنیوں کے ساتھ مل کر دس ریاستوں میں تجرباتی طور پر کام کر رہا ہے تاکہ اس ٹیکنالوجی اور لوگوں کی حفاظت اور سلامتی کے درمیان ایک توازن قائم کیا جا سکے۔ اسی طرح ''ناسا'' جیسے ادارے اس پر کام کر رہے ہیں کہ کس طرح پہلے سے ہی crowded فضا میں ڈرون کے استعمال کو بغیر کسی نقصان کے یقینی بنایا جا سکے۔

مصنوعی ذہانت میں ہونے والی ترقی اس بات کو ممکن بنائے گی کہ ڈرون کے استعمال میں وسعت کے ساتھ ساتھ اس کی کارکردگی میں نمایاں بہتری لائی جائے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ پرامید ہیں کہ بہت جلد سڑکوں کے ساتھ ساتھ اس طرح کے ڈرون پرواز کیا کریں گے جو حادثہ کے مقام پر جان بچانے والی ادویات کی فوراً ترسیل کر سکیں گے۔ اسی طرح ٹرانسپورٹ کے شعبے میں کام کرنے والی کمپنیاں اس پر کام کر رہی ہیں کہ بغیر پائلٹ کے چلنے والے ہیلی کاپٹر نما ڈرون بنائے جائیں جو انسانوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جائیں۔

آپ چاہے اسے پسند کریں یا نہ کریں لیکن آنے والے دنوں میں فضا پہلے سے زیادہ پرہجوم نظر آنے والی ہے۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"Drones are everywhere. Get used to it".
("Time". June 11, 2018)

''معارف فیچر'' حاصل کرنے کے خواہشمند خواتین و حضرات اور اداروں سے گزارش ہے کہ اپنے نام اور پتے کے ساتھ (رضاکارانہ طور پر) =/۵۰۰ روپے کا ڈاک ٹکٹ یا کراچی کے کسی بینک کا اتنی مالیت کا چیک ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی'' کے نام ارسال کریں۔ آپ کا بینک بیرونِ کراچی ہو تو پھر بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر بھیجیں۔ زرِ خریداری موصول ہو جانے کے بعد آپ کے دیے ہوئے پتے پر ''معارف فیچر'' کی ترسیل شروع ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ!

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950